www.KitaboSunnat.com
اختلافِ رائے
آداب واحکام
ڈاکٹر سلمان فہد عودہ

اختلاف رائے

آداب واحکام

ڈاکٹر سلمان فہد عودہ

ترجمہ

مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی

(شیخ الحدیث جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ)

۱۴۳۴ھ.....۲۰۱۳ء

نام کتاب: اختلاف رائے......آداب واحکام

مصنف : ڈاکٹر سلمان فہد عودہ

مترجم : مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی

اہتمام : المشرق، لاہور

مطبع : شفیق پریس، لاہور

الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، پاکستان
فون: 0092-42-37239884،37320318
ای میل: kitbsaray@hotmail.com

اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی
فون: 32212991-32629724

ولا یزالون مختلفین
إلا من رحم ربک
ولذلک خلقھم

(ہود:۱۱۸-۱۱۹)

(یہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر جس پر آپ کے رب کی رحمت ہو اور
(آپ اس کا غم نہ کیجئے کہ) آپ کے رب نے ان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے)

فہرست

عرض مترجم

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

آج اتحاد-اتحاد کا کچھ ایسا ماحول بن گیا ہے کہ دینی امور میں اختلاف واتحاد کو بھی کچھ ایسا رخ دے دیا گیا ہے کہ فرد سے لے کر حکومت تک، گھر سے لے کر پارلیمنٹ تک، اختلافات کو گوارا کرنے کے ساتھ آج دین کے باب میں بہت سے لوگ کسی طرح کے بھی اختلاف کو ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اور بس یہ رٹ ہے کہ دین کے نام سے سب ایک ہوں، حتی کہ عید اور نماز وروزہ بھی ایک ہو۔

خالق کائنات جس نے توحید خالق واتحاد خلق کا حکم دینے کے ساتھ کائنات میں طرح طرح کے اختلافات رکھے ہیں اور ان کو بطور انعام ذکر کیا ہے، ان اختلافات سے آنکھیں بند ہیں اور اس سے بھی کہ آخر اختلافات ہیں تو کیوں، اور ان کے پیچھے کیا اسباب ہیں؟ اور یہ کہ کیا دینی اختلافات صرف مفاسد ہی کو جنم دیتے ہیں یا یہ کہ ان کے پیچھے کچھ مصالح بھی کارفرما ہیں؟

آج اس کی ضرورت ہے کہ اس موضوع کو عام کیا جائے، اور تحریر وتقریر کے ذریعہ افراد امت تک یہ بات پہنچائی جائے کہ اختلاف ایک حد میں ناگزیر ہے، نہ اس سے بچا جا سکتا ہے اور نہ اس کو ختم کیا جا سکتا ہے، اور اس کے اسباب ومصالح، فوائد وثمرات کو بھی سامنے لایا جائے۔

دردمند خادمان دین وملت نے ہر زمانے میں اس موضوع پر لکھا ہے، اور آج بھی کام کرنے والے کام کر رہے ہیں، زیر نظر کاوش جو دراصل ترجمہ ہے، یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اور بڑی علمی وفکری نیز مفید ونافع چیز ہے، عربی سے اردو میں اس کا لانا مطالعہ کے بعد مفید ہی نہیں ضروری معلوم ہوا اسی کے تحت یہ کام انجام پا گیا۔

دعا ہے کہ حق تعالی اس کو ہمارے لئے زیادہ سے زیادہ نفع بخش بنائے۔

محمد عبید اللہ الاسعدی غفرلہ

پیش لفظ

احکام شریعت کی بنیادی دلیلیں چار ہیں، کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع اور قیاس، ان میں کتاب اللہ، حدیث متواتر اور اجماع اپنے ذریعۂ ثبوت کے اعتبار سے "قطعی" ہیں، جو حدیثیں اس درجہ کی نہ ہوں، وہ "ظنی" ہیں، یعنی اعتبار و استناد کے اعتبار سے کم درجہ پر ہیں، اسی طرح اگر حدیثوں میں بظاہر تعارض ہو، یہ معلوم نہ ہو کہ کونسا حکم پہلے کا ہے اور کونسا حکم بعد کا؟ یا کس حدیث کا محل اور موقع کیا ہے؟ تو تعارض کی وجہ سے یہ بھی ظنی کہلاتی ہیں۔

استنباط احکام میں دوسری اہم جہت یہ دیکھنے کی ہے کہ جو مفہوم اخذ کیا جا رہا ہے، اس پر قرآن و حدیث کے الفاظ کی دلالت یا قیاس کی تطبیق کس حد تک واضح اور ابہام و احتمال سے خالی ہے، یعنی اگر الفاظ کی دلالت اس مفہوم پر اس طرح ہے کہ اس میں کسی اور معنی کا احتمال نہیں، تو وہ "قطعی الدلالۃ" ہے اور اگر اس میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہو تو وہ "ظنی الدلالۃ" ہے، قیاس کو بھی اسی زمرہ میں رکھا گیا ہے؛ کیوں کہ قیاس کا حکم مماثلت کی بنیاد پر دیا جاتا ہے، نص میں کوئی صراحت نہیں ہوتی اور بعض دفعہ دو مماثل صورتوں کے احکام ایک دوسرے سے مختلف بھی ہوتے ہیں۔

پس قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ احکام میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ کوئی فرقۂ باطلہ ایسی فاسد تاویل کرے، جس پر کوئی دلیل موجود نہ ہو؛ کیوں کہ ایسے اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں؛ البتہ جو احکام ثبوت، تعارض یا اپنی مراد پر دلالت کرنے کے اعتبار سے ظنی ہوں، ان میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔

یہ اختلاف رائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے؛ کیوں کہ لوگوں کی سوچ میں جو فرق ہے اور اس کی وجہ سے جو اختلاف رائے پیدا ہو رہا ہے، وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا اور یہ بات بھی

اللہ کی قدرت میں تھی کہ ان مسائل کو قرآن مجید ہی میں صراحت ووضاحت کے ساتھ بیان کر دیا جاتا؛ تاکہ کوئی اختلاف کی نوبت نہ آئے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں فرمایا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کو یہ بات منظور ہے کہ بعض مسائل میں اختلاف رائے کی گنجائش باقی رہے؛ لیکن مقصد میں کوئی اختلاف نہ ہو، اور وہ ہے اللہ کی رضا کو حاصل کرنے کی کوشش اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت واتباع، اس کی ایک مصلحت یہ ہے کہ یہ اختلاف، امت کے لئے سہولت پیدا کرتا ہے، بعض اوقات اگر ایک رائے پر عمل کرنا دشوار ہو جائے تو دوسری رائے اختیار کرنے کی گنجائش رہتی ہے؛ اسی لئے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے کہ صحابہ تمام باتوں میں متفق ہوتے تو ہمیں خوشی نہیں ہوتی، ان کا اختلاف ہمارے لئے باعث مسرت ہے؛ کیوں کہ ہم ان میں سے کسی بھی رائے پر عمل کرلیں تو ہمیں اطمینان رہتا ہے کہ ہم ایک صحابی کی رائے پر عمل کررہے ہیں، اسی طرح چوتھی صدی ہجری کے بعد جب تقلید کا غلبہ ہوا تو بہت سے مسائل میں ایک فقہ کے متبعین نے دوسرے فقہاء کے نقطۂ نظر سے فائدہ اٹھایا، خود ہندوستان میں فسخ نکاح سے متعلق احکام میں احناف زیادہ تر فقہ مالکی پر عمل کرتے ہیں۔

اس اختلاف رائے کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لئے ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل ہونے والی کتاب کو بھی محفوظ رکھا ہے اور حدیث نبوی کی شکل میں آپ کے فرمودات اور معمولات بھی محفوظ ہیں، اختلاف رائے کا فائدہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مختلف سنتیں صرف کتابی طور پر ہی محفوظ نہیں ہیں؛ بلکہ امت کے عمل کے ذریعہ بھی اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لئے اسے محفوظ کردیا ہے، گویا یہ نبوت محمدی کا اعجاز ہے کہ جیسے آپ کی نبوت قیامت تک کے لئے ہے، ویسے ہی آپ کا عمل قیامت تک کے لئے زندہ رہے گا۔

اس لئے اختلاف رائے سے ہرگز متوحش ہونے کی ضرورت نہیں؛ بلکہ دو باتیں ضروری ہیں: ایک یہ کہ آدمی جس نقطۂ نظر پر خود مطمئن ہو وہ اس پر قائم رہے؛ لیکن دوسرے کو بھی اپنی رائے میں مخلص سمجھے، اس کی نیت پر حملہ نہ کرے، دوسرے: فریق مخالف کا بھی احترام ملحوظ

رکھے اور اس اختلاف کو دوسرے کی بے احترامی کا سبب نہ بنائے، حاصل یہ ہے کہ ایسے مسائل میں شدت نہ ہو اور اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہو، یہ اس وقت کی بڑی اہم ضرورت ہے؛ کیوں کہ اسلام دشمن طاقتیں نسلی، لسانی، جغرافیائی، اور خاص کر مسلکی اختلافات کو ابھارنے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہیں، مذہبی گروہ دانستہ کم اور نادانستہ زیادہ ان کے آلۂ کار بن رہے ہیں، ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے زمانہ کے نبض شناس، بالغ نظر اور دین و شریعت کی روح سے آگاہ اہل علم نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، نیز اس پر مزید لکھنے اور اس پر بار بار کہنے کی ضرورت ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک نہایت اہم تالیف یہ کتاب ہے، جو ممتاز مفکر ڈاکٹر سلمان فہد عودہ کے قلم سے ہے، اس میں اختلاف کی شرعی حیثیت، اختلاف کے آداب، اس سلسلہ میں اصول و قواعد وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ہر بات دلیل کے ساتھ کہی گئی ہے، واقعہ ہے کہ موجودہ حالات کے پس منظر میں یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر عالم اور داعی کی نظر سے گذرے، دینی مدارس میں طلبہ کے مطالعاتی نصاب میں شامل کی جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اسے پہنچایا جائے۔

اللہ تعالیٰ جزاء خیر عطا فرمائے رفیق گرامی حضرت مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب (سکریٹری برائے سیمینار) کو، کہ انہوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اس کتاب کو اردو کا جامہ پہنایا ہے اور پوری علمی بصیرت کے ساتھ اس کا ترجمہ کیا ہے، اس طرح ایک اہم موضوع پر پیش کی جانے والی یہ علمی سوغات اردو قارئین تک پہنچ رہی ہے، اردو دنیا کو اس پر مؤلف اور مترجم دونوں کا شکر گذار ہونا چاہئے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اکیڈمی کی اس پیشکش کو قبول فرمائیں اور یہ امت کو افتراق و انتشار سے بچانے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ وباللہ التوفیق

۲۵ / صفر المظفر ۱۴۳۳ھ — خالد سیف اللہ رحمانی

۲۰ / جنوری ۲۰۱۲ء — (جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

مقدمۂ کتاب

امت محمدیہ آج جن چیزوں سے دوچار ہے، اور آج سے پہلے بھی دوچار تھی، ان میں اہم ترین چیز بظاہر ''اختلاف'' کا معاملہ ہے جو امت کے افراد وجماعتوں، مذاہب وحکومتوں سب کے درمیان پایا جاتا رہا اور پایا جاتا ہے، یہ اختلاف کبھی بڑھ کر ایسا ہو جاتا ہے کہ گروہ بندی تک پہنچ جاتا ہے، اور یہ گروہ بندی باہمی دشمنی تک اور پھر دشمنی باہم جنگ وجدال تک کا ذریعہ بنتی ہے۔

اور یہ چیزیں اکثر دینی رنگ وعنوان بھی اختیار کر لیتی ہیں، جس کے لئے نصوص وحی میں توجیہ وتاویل سے کام لیا جاتا ہے، یا امت کے سلف صالح صحابہ وعلماء واصحاب مذاہب کے معاملات وحالات سے استناد حاصل کیا جاتا ہے۔

اور اختلاف چونکہ اساسی طور پر دین کی رو سے کوئی منکر چیز نہیں ہے، بلکہ وہ ایک مشروع چیز ہے جس پر کتاب وسنت کے بے شمار دلائل موجود ہیں، لیکن اس کے نتیجے میں جو سلبی چیز سامنے آتی ہے، عمومی طور پر ہو یا امت محمدیہ کی تاریخ واحوال میں خصوصیت کے ساتھ وہ ہے ایسا افتراق وتحزب کہ جو نفس اختلاف سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ اختلاف سے متعلق قواعد وضوابط کا غلط استعمال اس کا باعث بنتا ہے اور یہ غلط استعمال اس انجام بد مآل تک پہنچا دیتا ہے۔

اور دین میں اختلاف کی جو شرعاً وسعت ہے وہ اس لئے نہیں کہ اختلاف خود ذاتی طور پر مقصود ومطلوب ہے بلکہ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اس کے واسطے سے بہت سی مصالح کا تحقق ہوتا ہے، وہ سامنے آتی ہیں، خاص طور سے یہ کہ زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے میں امت کو وسعت ملتی ہے، کیونکہ انسانی زندگی کو طرح طرح کے امور وحالات کا سامنا رہتا ہے، نیز زمان ومکان کا

فرق واختلاف بھی ایک اہمیت رکھتا ہے۔ اور اگر امت کو ہر حال میں بس ایک ہی حکم وحال پر مجبور کیا جائے تو اس کی وجہ سے اس کو بڑی مشقت وپریشانی نیز تنگی ہوگی، لہذا جو مواقع اختلاف کی گنجائش رکھتے ہیں ان مواقع میں اگر مختلف قسم کے اجتہادات ہوں گے تو اس کے نتیجے میں درپیش معاملات میں مختلف حل ومتعدد آراء ملیں گی، پھر لوگ مختلف حالات میں اپنی زندگی کے مناسب ومتقاضی دوائیں۔ دین کے ہسپتال سے حاصل کر سکیں گے، یہ دوائیں بظاہر تو مختلف ہوں گی لیکن بنیادی واصولی طور پر ایک ہی ہوں گی۔

اس لئے آج امت کو جو بڑے چیلنج درپیش ہیں بالخصوص اختلاف کی نسبت سے ان میں یہ چیلنج بہت اہم ہے کہ امت کی صفوں میں پائے جانے والے اختلاف وانتشار کو منظم کیا جائے، جس کی صورت صرف یہی ہے کہ اختلاف سے متعلق تعلیمات وہدایات، احکام ورہنمائیوں کو امت کے اندر عام کیا جائے، جن کی بناء وبنیاد مضبوط ومنظم قواعد، علمی آداب اور اخلاقی اصول وضوابط پر ہو اور پھر ان کے واسطے سے اختلاف کے قابل تعریف نتائج وآثار تک پہنچا جائے اور ان کو حاصل کیا جائے، اس سے مراد ان کا وہ ایجابی رخ وپہلو ہے جو امت کی ہر حاجت پر لبیک کہے کہ اس سے اس کو پورا کیا جائے اور جو امت کی ہر مشکل کا حل پیش کر سکے اور اس میں مد ومعاون ہو، اور ان کے واسطے سے اختلاف کے سلبی آثار ونتائج سے بچا جا سکے جو باہم جنگ وجدال تک اور مآلاً امت کے زوال تک پہنچاتے ہیں۔

صحیح وبار آور اختلاف سے متعلق مناسب ومفید تعلیمات وہدایات کی اشاعت کر کے مذکورہ چیلنج کے جواب ودفاع میں حصہ لینے کی غرض سے ہم "قضايا الأمة" (امت کو درپیش مسائل) سے متعلق تصنیفی سلسلہ کی چوتھی کڑی اس کتاب کی صورت میں پیش کر رہے ہیں جس کو "فقه الاختلاف – ولا يزالون مختلفين" کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔

اس کے مؤلف فضیلۃ الشیخ دکتور سلمان فہد عودہ ہیں۔ ہمارے علم کے مطابق ان کی

شخصیت ان لوگوں میں سے ہے کہ جو اس موضوع کی تحقیق و توضیح پر کافی قدرت رکھتے ہیں، اس لئے کہ موصوف ایک طرف تو علم اصول پر کافی عبور رکھتے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کے اختلافات کی واقعی تاریخ - خواہ ایجابی ہو یا سلبی - اس سے بھی خوب واقف ہیں، مزید برآں یہ کہ مسلمانوں اور مسلم ممالک کا ماحول جس قسم کے اختلافات سے دوچار ہے ان کی بابت بھی ان کو بڑی معلومات و مہارت ہے۔

یہ سب امور ایسے ہیں کہ جو آدمی کے لئے اس کا پورا موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ اصول کو وقائع سے جوڑے اور پھر ان چیزوں کا استنباط و استخراج کرے جن کی مدد سے مسلمانوں کے اختلافات کی وہ علمی و عملی، صاف ستھری حیثیت بنے اور نکھرے جو ان کو اختلافات کی پراگندگی اور بے اناری سے نکال سکے، جس سے آج سارا عالم اسلام گونج رہا ہے اور جو امت کی زندگی پر سلبی اثر ڈال رہا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب اس مقصد کی راہ کا ایک قدم ہے، اس میں مؤلف موصوف نے اساسی حیثیت سے اختلاف کی شرعی نوعیت کا تذکرہ کیا ہے، اور اس کو کتاب وسنت، نیز صحابہ وعلماء مجتہدین کی سیرت و کردار کی روشنی میں واضح کیا ہے، اور اس مشروعیت کے پیچھے نظری و عملی طور پر جو صالح نتائج و ثمرات ہیں ان کی طرف اشارہ کیا ہے، جیسے کہ ان آداب کو بھی بیان کیا ہے جن کی رعایت اس غرض سے کی جانی چاہئے تا کہ اختلاف سے وہ صالح فائدہ و ثمرہ حاصل کیا جا سکے جو اس کی مشروعیت سے مقصود ہے، خواہ یہ اس سلسلے کے اخلاقی آداب ہوں یا عملی و انتظامی۔

مؤلف نے اس کتاب میں ان اسباب کو بھی سامنے رکھا ہے جو اختلاف کا باعث بنتے ہیں، چنانچہ ان میں سے بعض اہم اسباب کا تذکرہ کیا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ اختلاف کی بنا پر پائے جانے والے انتشار وافتراق کے علاج ودفعیہ کے لئے خود ان اسباب کا جاننا و سمجھنا بھی ضروری ہے۔

اس کے بعد مرکزی گفتگو ان بنیادی قواعد پر کی ہے جن پر اختلاف کو مبنی ہونا چاہئے اور دائرہ وسائر رکھنا چاہئے تاکہ اختلاف صحیح اور صاف ستھرے رخ والا اختلاف ہو، یہ تو گفتگو مؤلف نے علمی ونظریاتی جہت سے کی ہے۔

اور عملی وتطبیقی جہت کے مدنظر مؤلف نے اپنی گفتگو وبحث کو اس پر ختم کیا ہے کہ اختلاف، اختلاف کے درمیان فرق کرنا ضروری ہے، کہ ایک وہ اختلاف ہوتا ہے جس میں اخلاقی وبنیادی شرطیں پورے طور پر ملحوظ ہوں تو اختلاف نفع بخش وسودمند ہوتا ہے، اور دوسرا اختلاف وہ ہے کہ جس میں یہ شرطیں مفقود یا ناقص وکمزور سطح کی ہوتی ہیں تو ایسا اختلاف نقصان وضرر کا باعث بنتا ہے۔

یہ کتاب اپنی پوری تفصیل میں اس انداز پر مرتب کی گئی ہے کہ اس میں علمی وبنیادی انداز میں اختلاف کے قضیہ کو پیش کیا گیا ہے اور بنیادی دلائل کو تاریخ کے علمی واقعات کے ساتھ مرتبط کیا گیا ہے، اور موقع بموقع بہت سی مناسب مثالیں بھی ہر قبیل کی ذکر کی گئی ہیں۔

اور اپنی اس علمی وبنیادی خوبی کے ساتھ، اس کا ایک بڑا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کا اسلوب نرم، انداز سہل کہ جس کو امت کے عام پڑھے لکھے لوگ قبول کریں اور پسند بھی کریں۔

امت کو درپیش مسائل کے سلسلہ کی کتابوں کا یہی عام نہج ومنہج رہا ہے، اس لئے کہ اس سعی کا مقصد یہ ہے کہ اس سلسلے کی نشر کی جانے والی کتابیں مسلمانوں کے درمیان اس تعلیم وتہذیب اور ثقافت کو عام کریں وپھیلائیں جو ایسی مشکلات کا حل فراہم کر سکے، جن کو اس سلسلے کی کتابوں میں لیا جاتا ہے اور موضوع بنا کر اس کی بابت گفتگو وتحقیق کی جاتی ہے۔

اخیر میں اس امر کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ یہ کتاب اس سے پہلے "ولا یزالون مختلفین" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی لیکن اس اشاعت کے موقع سے اس کی ترتیب ومضامین میں نظر ثانی کے بعد اس کا نام "فقه الاختلاف" کر دیا گیا جبکہ سابق نام کو بھی ساتھ

میں باقی رکھا گیا، اور یہ اس سلسلے کا جو مقصد وہدف ہے اس کی مناسبت کی رعایت میں کیا گیا ہے، کیونکہ مقصد وہدف ہے ایسی منظم فقہ کو پیش کرنا جو طرح طرح کے اور مختلف قسم کے درپیش مسائل ـــــ جن میں کتاب کا موضوع بھی ہے ـــــ کے حق میں امت کے لئے ایک بہتر رہبری اور تعلیم وثقافت کا کام کر سکے۔

"**الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین**" کا شعبۂ تالیف وترجمہ ان حضرات کا بہت مشکور ہے جنہوں نے اس سلسلے کے مسائل وموضوعات پر تحقیقی کاموں کے پیش کرنے میں حصہ لیا، جن میں سرفہرست فضیلۃ الشیخ یوسف القرضاوی ہیں، پھر فضیلۃ الشیخ فیصل مولوی وفضیلۃ الشیخ علی قرہ داغی ہیں اور آخری کڑی شیخ سلمان فہد عودہ ہیں۔

اس موضوع سے متعلق آنے والی چیزیں الاتحاد العالمی کے اعضاء واراکین، علماء ومفکرین کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ امت کو درپیش اہم مسائل وموضوعات پر تحقیقی کتابیں وبحثیں تیار کریں تاکہ اس سلسلہ وکڑی میں ان کو شامل کیا جا سکے۔ وللہ الأمر من قبل ومن بعد۔

شعبۂ تالیف وترجمہ
اتحاد عالمی برائے علماء مسلمین

فصل اول

اختلاف کی شرعی حیثیت

۱- اختلاف شرعی نقطۂ نظر سے

۲- اختلاف اور حضرات صحابہ وعلماء امت

(۱)

اختلاف شرعی نقطۂ نظر سے

اللہ سبحانہ وتعالی نے اختلاف کو دنیوی زندگی اور اہل دنیا کی فطرت وطبیعت کا ایک جزء بنایا ہے حتی کہ باپ اور بیٹے کے درمیان بھی اختلاف پایا جاتا ہے باوجودیکہ بیٹا اپنے باپ سے وجود پاتا ہے اور اس کے وجود کا ایک جزء وحصہ ہوتا ہے پھر بھی باپ و بیٹے کے درمیان مختلف قسم کے اور مختلف وجوہ سے اختلافات پائے جاتے ہیں مثلاً فکر ومزاج اور شکل وصورت ورنگ وغیرہ۔

اور اس کے باوجود کہ اختلاف ایک ربانی نظام ودستور ہے مگر لوگ اس کی وجہ سے بہت تنگ دل ہوتے ہیں اور پھر اس قسم کے سوالات کرتے ہیں کہ آخر علماء کے درمیان یہ اختلافات کب تک رہیں گے؟ اور مسلمانوں کا اختلاف کب تک رہے گا؟ آخر سب مسلمان ایک اور متفق ومتحد کیوں نہیں ہوتے؟

اس قسم کے سوالوں کا جواب یہ ہے کہ یہ اختلاف تو اس وقت تک باقی رہے گا جب تک دنیا قائم ہے اور جب تک دنیا فنا نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کو تو سوچو ہی نہیں یا یہ کہ یہ خواب ہی مت دیکھو کہ لوگ کبھی ہر قسم کا اختلاف ختم کر کے پورے طور پر متفق ومتحد ہو جائیں گے، ارشاد ربانی ہے:

"**ولا یزالون مختلفین إلا من رحم ربک**" (ہود: ۱۱۸-۱۱۹) (اور یہ لوگ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر جس پر آپ کا رب رحم کردے)۔

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اختلاف کا وجود حق تعالی کی طرف سے

ہے اور یہ اس کی تقدیر ہے، اور از روئے تقدیر ہی اس کا وقوع ہے، البتہ شریعت کی رو سے بعض اختلافات (جائز و) مقبول ہوتے ہیں اور بعض مذموم (و ناجائز ہوتے ہیں)۔

اگر تمہارا یہ گمان ہو کہ علم کی وسعت اور تدین کی کثرت سے اختلاف ختم ہو سکتا ہے اور ہو جاتا ہے تو اپنے اس گمان کی اصلاح کرلو، کیونکہ جو حضرات انسانوں میں بڑے صاحب علم، کتاب و سنت سے خوب واقف اور انتہائی مخلص نیز خواہشات نفسانیہ سے انتہائی دور ہوتے ہیں تم ان میں بھی اختلاف پاؤ گے۔

ائمہ امت کے درمیان پائے جانے والے اختلافات سے متعلق گفتگو کرنے والے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے اختلافات کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں، اس لئے کہ ان حضرات کے درمیان بہت سے اختلافات ہوئے جیسے حضرات انصار کے درمیان پیدا ہونے والا ایک اختلاف، جس کی طرف حق تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے:

"وإن طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فأصلحوا بينهما فإن بغت إحداهما على الأخرى فقاتلوا التي حتى تفيئ إلى أمر الله فإن فآءت فأصلحوا بينهما بالعدل..." (الحجرات:۹)۔

(اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کرو (صلح کرادو) پھر اگر ان کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو، جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے پھر اگر رجوع ہو جائے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کردو)۔

اس آیت میں ان کے جس قتال وجدال کا تذکرہ ہے وہ بس زبانوں اور ہاتھوں کے استعمال کی ہی حد تک تھا (ملاحظہ ہو: صحیح بخاری: ۲۶۹۱، صحیح مسلم: ۱۷۹۹، درمنثور ۱۳/ ۵۵۴-۵۵۸)، اور ان کا یہ اختلاف دراصل ایک سابق اختلاف کا اثر و ردعمل تھا جو اسلام کی آمد سے پہلے انصار میں اوس وخزرج کے درمیان پایا جاتا تھا۔

اسی طرح حضرات انصار کے ایک خاندان بنوعمرو بن عوف کا اختلاف جس کو ختم کرنے کے لئے نبی اکرم ﷺ تشریف لے گئے اور ان کے معاملات کو حل کرنے میں آپ کچھ ایسا مشغول ہوئے کہ نماز کے وقت (مسجد نبوی تک) پہنچنے میں تاخیر ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کو نماز پڑھائی (ملاحظہ ہو: صحیح بخاری: ۶۸۴، صحیح مسلم: ۴۲۱)۔

اسی طرح غزوہ بنوقریظہ کے موقع سے صحابہ کرام کا اختلاف جبکہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا:

"لا يصلين أحد العصر إلا في بني قريظة" (صحیح بخاری: ۹۴۶، صحیح مسلم: ۱۷۷۰ عن ابن عمر و اللفظ للبخاری) (عصر تو بنوقریظہ ہی میں پڑھنی ہے)۔

بعض حضرات نے آپ کے اس ارشاد کا مطلب یہ لیا کہ مقصد جلدی کرنا و چلنا ہے کہ تاخیر نہ ہو تو انہوں نے راستے میں نماز پڑھ لی اور بعض حضرات نے اس کو ظاہر پر رکھا (اور اس کا مطلب یہ سمجھا کہ آپ نے مطلقاً منع فرمایا ہے) تو انہوں نے بنوقریظہ میں پہنچ کر ہی عصر کی نماز ادا کی، نبی اکرم ﷺ کو فریقین کے عمل کا علم ہوا اور آپ ﷺ نے کسی کو کچھ نہ کہا۔

ایسے ہی حضور ﷺ کی وفات کے معاً بعد صحابہ کے درمیان پیدا ہونے والا اختلاف ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے جانشین کے متعلق صحابہؓ میں اختلاف ہوا، حضرات انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور انہوں نے حضرت سعد بن عبادہؓ کا نام تجویز کیا، اگرچہ بعد میں سب حضرت ابوبکر صدیقؓ پر متفق ہو گئے کہ حضرت ابوبکر نے ان کو اس بابت حضور اکرم ﷺ کی ہدایات سنائیں اور یہ بتایا کہ امارت و خلافت کا نظام تو قریش ہی میں صحیح رہ سکتا ہے (ملاحظہ ہو: مسند احمد ۱۸، صحیح بخاری: ۶۸۳۰، بدایہ ونہایہ ۸۱/۸ - ۹۳)۔

ایسے ہی مرتدین سے جنگ کے متعلق صحابہ کا اختلاف تھا کہ یہ جنگ کن لوگوں سے کی جائے؟ تمام مرتدین سے یا صرف ان لوگوں سے جنگ کی جائے جنہوں نے حضور اکرم ﷺ

کی نبوت پر ایمان سے اعراض کیا اور جو لوگ محض زکاۃ کی ادائیگی سے منکر ہیں (باقی ایمان کو مکمل طور پر نہیں چھوڑا ہے) ان کے معاملہ کو مؤخر کیا جائے، لیکن جب حضرت ابوبکرؓ نے ان کے سامنے حدیث نبوی روایت کی:

"أمرت أن أقاتل الناس... الحدیث" (مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں الخ)۔

اور صحابہ نے نماز و زکوۃ کے درمیان فرق کرنے والوں سے جنگ کرنے پر ان کی قوت اصرار کو دیکھا اور یہ سمجھا کہ ان کا نقطۂ نظر درست ہے تو سب نے ان کی بات کو تسلیم کر لیا، حضرت ابوبکرؓ سے اختلاف کرنے والوں کے سرخیل حضرت عمر بن خطابؓ تھے، اس کے بعد اس مسئلہ میں سب ہم رائے ہو گئے (ملاحظہ ہو: صحیح بخاری: ۶۹۲۴، ۶۹۲۵، صحیح مسلم: ۲۰، بدایہ ونہایہ ۹/ ۴۳۷)۔

اسی طرح بہت سے شرعی مسائل اور وقتی مسائل میں صحابہؓ کے درمیان ابتداءً اختلاف ہوا لیکن بعد میں ایسے اکثر مسائل میں وہ ایک رائے ہو جاتے تھے اور خاص طور سے بڑے اور دور رس اثرات رکھنے والے معاملات و امور میں ان کا اختلاف ضرور ختم ہو گیا، البتہ بہت سے فقہی و علمی مسائل میں ـــــ جن کی بابت شریعت میں کوئی قطعی و دوٹوک نص و دلیل نہیں ہے ـــــ ان کا اختلاف برابر باقی رہا۔

تو جو لوگ امت میں سب سے بہتر و افضل اور سب سے پاکیزہ، نیز سب سے زیادہ (امت کی ضرورت کا) علم رکھنے والے تھے، جب ان کے درمیان اختلافات ہوئے تو دوسروں کے متعلق سوچا جا سکتا ہے (کہ ان میں اختلاف کیوں نہ ہوگا اور کیسے نہ ہوگا)۔

اور بالفرض اگر ہم یہ مان لیں کہ علم کی وسعت، یا کمال اخلاص کی بنا پر اختلاف ختم ہو جاتا ہے یا ہو سکتا ہے تو خود یہ مفروضہ ہم کو تاکیدی طور پر بتاتا ہے کہ وقت کے گذرنے کے ساتھ اختلاف میں وسعت ہوتی جائے گی، کیونکہ کچھ لوگ ہر زمانہ میں بہرحال کچھ نہ کچھ کمیوں کا

شکار ہوں گے، علم، فہم، اخلاص، صفائی قلب و پاکیزگی نفس وغیرہ ان سارے امور میں، یہ ہوگا، جبکہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد بھی ہے:

"لا يأتي عليكم زمان إلا الذي بعده شرّ منه حتى تلقوا ربكم"

(بخاری: ۷۰۶۸ عن انس بن مالکؓ)۔

(تم پر جو بھی زمانہ آئے گا بعد والا زمانہ اس سے برا ہی ہوگا حتی کہ تم لوگ اپنے رب تک پہنچ جاؤ)۔

آپ ﷺ کی یہ بات اجمالی طور پر کہی گئی ہے (یعنی عمومی حیثیت سے۔کلی طور پر نہیں کہ بعد میں خیر سرے سے ہوگا ہی نہیں)۔

یہ وقتی جذبات جن کے متعلق ہم لوگ باتیں کرتے رہتے ہیں یہ قابل توجہ نہیں ہیں کیونکہ جن باتوں کو ہم دوسروں میں محسوس کرتے ہیں ان کو ہم خود اپنے اندر بھی پاتے ہیں بلکہ بسا اوقات دوسروں سے زیادہ پاتے ہیں، خواہ ہم ان کا احساس کریں یا نہ کریں، دیکھو تم کاروبار میں اپنے ساتھی و رفیق کے ساتھ اختلاف کرتے ہو، اسی طرح اپنے حقیقی بھائی اور پڑوسی سے بھی اختلاف رکھتے ہو، اور کیا یہ نہیں ہوتا کہ اس قسم کے اختلافات تم کو کبھی کبھی، ایک مرتبہ ہو یا زائد بھی، عدالت تک پہنچا دیتے ہیں اور پھر فیصلے کی نوبت آتی ہے جو اختلاف کو ختم کرتی ہے مگر اس طرح کہ دلوں میں کچھ میل رہ ہی جاتا ہے، تو (دوسرے کو بھی اپنی ہی طرح سوچو کہ) دوسرا بھی تمہاری ہی طرح ہے۔

اور کبھی کبھی تم (اپنے سے غیر متعلق) اختلاف کا (بھی) جزء و حصہ اس طرح بن جاتے ہو کہ کسی اختلاف میں اس کی اور اس کی بات (ادھر ادھر) نقل کرتے ہو اور زندگی و عمل نیز علم و دعوت کے جزئی و معمولی مسائل میں الجھ جاتے ہو اور بہت سے اہم و بڑے امور میں صرف نظر کرتے ہو جبکہ ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ تم ان کی طرف کچھ زیادہ ہی توجہ دو اور ان کی

زیادہ فکر کرو۔

اس بابت ایک دلچسپ قصہ آتا ہے جو امام احمدؒ سے متعلق ہے کہ ان کے پاس ایک نوجوان آیا جس کا نام ابوجعفر قطیعی تھا اور وہ ان کے پاس بیٹھ گیا اور ان سے کہا کہ کیا آپ گچ کے پانی سے وضو کرتے ہیں؟ امام احمدؒ نے فرمایا کہ مجھ کو یہ پسند نہیں ہے، اس نے کہا کہ کیا آپ باقلاء کے پانی سے وضو کرتے ہیں؟ فرمایا: میں اس کو پسند نہیں کرتا، اس نے کہا کہ کیا آپ گلاب کے پانی سے وضو کرتے ہیں؟ فرمایا کہ مجھ کو یہ بھی پسند نہیں ہے، اس کے بعد وہ طالب علم جانے کی غرض سے اٹھنے لگا تو امام احمدؒ نے اس کا کپڑا پکڑ لیا اور فرمایا کہ یہ بتاؤ کہ تم جب مسجد کے اندر داخل ہوتے ہو تو کیا کہتے ہو (اور کیا دعا پڑھتے ہو)؟ وہ خاموش رہا، فرمایا کہ مسجد سے نکلتے وقت کیا کہتے ہو، وہ خاموش رہا، اس پر فرمایا کہ جا کر یہ سب سیکھو (طبقات الحنابلہ لابن ابی یعلی ۱/۴۱)۔

یہ امام احمدؒ کی فقاہت تھی کہ انہوں نے مسئلہ سے متعلق اپنی رائے اس کو بردباری سے بتادی کیونکہ یہ مسئلہ اجتہاد اور نظر وفکر کا مسئلہ تھا اور ایک شریعت کا قطعی حکم ہوتا ہے جس کی مخالفت جائز نہیں ہوتی ہے، اور ایک وہ مسئلہ ورائے ہے جو کسی عالم کا اجتہاد ہو کہ جس میں خطأ وصواب دونوں کا احتمال ہوتا ہے، ان دونوں کے درمیان فرق ہے، اسی لئے امام ابوحنیفہؒ فرماتے تھے: ہمارا یہ کلام ایک رائے ہے، اگر کوئی آدمی ہمارے پاس اس سے اچھی رائے لے کر آئے تو ہم اپنی بات ورائے کو چھوڑ کر اس کی رائے کو اختیار کرلیں گے۔

یہی بات ہے کہ جس کی وجہ سے ہم نے دیکھا کہ امام احمدؒ نے کس طرح اس طالب علم کے لئے بڑے ہی اچھے انداز میں حقیقت کو واضح کیا تاکہ اس کے اندر اپنی بات کے لئے ان سے زیادہ جوش نہ پیدا ہو، اور وہ اس کو سمجھے محسوس کرے کہ حق یہی ہے جس کو امام صاحب نے کہا اور یہی دین ہے، اور یہ ایسی چیز ہے جس کے لئے دوستی وعداوت روا ہے، جبکہ وہ جس مسئلہ کو معلوم کر رہا تھا وہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا۔

بنیادی بات یہاں پر یہ ہے کہ امام احمدؒ نے اس طالب علم کو موقع دیا کہ وہ اپنی بات کو پورے طور پر کہہ لے، پھر اس کے کپڑے کو پکڑا اور اس سے اذکار وادعیہ سے متعلق مسئلہ کو پوچھا اور جب یہ بات سامنے آئی کہ وہ ان اذکار کو نہیں جانتا تو اس کے ساتھ تنگی وسختی کا معاملہ نہیں کیا، بلکہ اس سے فرمایا کہ جا کر یہ سب سیکھو، یعنی اختلافی اور قیل وقال کے مسائل میں زیادہ نہ پڑو، جس کے تم اہل بھی نہیں ہو بلکہ خاص اپنی ضرورت کے دینی وعلمی مسائل میں خود کو مشغول کرو، پھر جب علماء یا بڑے طلباء کے مقام ومرتبہ تک پہنچ جانا تو اس وقت اس کے مطابق بات کرنا کہ ہر حال کے مطابق الگ بات ہوتی ہے، اور ہر مقام کے مناسب جداگانہ کلام ہوتا ہے اور ہر مرحلہ کے لئے اس کے مناسب شرعی ہدایت وحکم ہوا کرتا ہے۔

بہر حال اختلاف تو اس وقت تک رہے گا کہ جب حق تعالی اس زمین اور اس پر بسنے والوں کے وارث ہوں گے، لہذا جب ہمارے سامنے ایسے اختلافات آئیں جو ہمارے دلوں کے لئے کلفت وتکلیف کا باعث ہوں تو ہم کو ان کی وجہ سے بہت پریشان ومتاثر نہیں ہونا چاہئے، کہ یہ اللہ کا لطف ورحمت ہے کہ اس نے ہم کو پہلے سے بتا دیا ہے کہ یہ سب ہو کر رہے گا، تا کہ ہم کو اس کی وجہ سے تکلیف نہ ہو اور نہ ہم اس سے عاجز ہوں کہ واقع کو گوارا کریں اور سمجھیں اور نہ اس سے کہ اس کے علاج وحل کے لئے تدبر و پوری سمجھداری سے کام لیں۔

نبی اکرم ﷺ نے ازروئے قدر وتقدیر مستقبل میں پیش آنے والی جو ایسی چیزوں کی خبر دی ہے جو کہ شریعت کے خلاف ہوں گی، ان خبروں کے فوائد میں یہ باتیں بھی ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی متفق علیہ حدیث میں فرمایا ہے:

"لتتبعن سنن من كان قبلكم، شبرا بشبر، وذراعاً بذراع، حتى لو دخلوا جحر ضب لتبعتموهم قلنا: يا رسول الله اليهود والنصارى؟ قال: فمن"

(بخاری: ۷۳۲۰، مسلم: ۲۶۶۹ واللفظ للبخاری)۔

تم لوگ اپنے پیشرولوگوں کی ایک ایک بالشت اور ایک ایک ہاتھ۔یعنی پورے طور پر۔ پیروی کر کے رہو گے حتی کہ اگر وہ لوگ کسی گوہ کے بل میں داخل ہوئے ہوں گے تو تم بھی ایسا کرو گے، ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! (ہمارے پیشرو سے مراد) یہود ونصاری (ہیں)؟ فرمایا: پھر کون)۔

مستقبل میں پیش آنے والے ان امور کی جو رسول اللہ ﷺ نے خبر دیدی تو اس سے ان کے پیش آنے کا بوجھ دلوں پر کم ہو گیا، اور اس کی وجہ سے ان کے پیش آنے کے موقع سے ایک مسلمان کرب وضیق اور انقباض سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ ان امور کے حق میں تاثر وتشنج کی کیفیت میں پڑنے کے بجائے ان کے ساتھ واقع کے مطابق اور سمجھداری کا معاملہ کرتا ہے، اور اس طرح معاملہ کرتا ہے کہ وہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ میں عہد نبوت میں یا اس کے بعد کے فضل وکمال والے زمانے میں نہیں ہوں۔

اور جو چیز غلط وخطأ ہوتی ہے اس سے سکوت بھی نہیں کرتا، البتہ اس میں تبدیلی لانے کی سعی وتدبیر اور کوشش کرتا ہے اور اس کے لئے وہ حلم وبردباری، صبر وتحمل، برداشت ومجاہدہ سے کام لیتا ہے اور اس روح کو اپناتا واختیار کرتا ہے جو خواب وخیال والی چیزوں اور واقع سے بے پروائی سے دور ہو۔

جبکہ اس قسم کی نبوی خبریں، نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے دلائل میں سے ہیں:

"ولما رأى المؤمنون الأحزاب قالوا هذا ما وعدنا الله ورسوله وصدق الله ورسوله وما زادهم إلا إيمانا وتسليما" (الاحزاب:۲۲)۔

(اور جب ایمانداروں نے ان لشکروں کو دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ وہی ہے جس کی ہم کو اللہ اور اس کے رسول نے خبر دی تھی اور اللہ ورسول نے سچ فرمایا تھا، اور اس سے ان کے ایمان وطاعت میں ترقی ہو گئی)۔

حضور ﷺ اپنے راز دار حضرت حذیفہ بن یمان کو فتن کی باتیں بتایا کرتے تھے، حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ کی بعض باتوں کو میں بھول جاتا ہوں پھر جب اس کو دیکھتا ہوں تو یاد آجاتی ہیں جیسے ایک آدمی کو کسی کا چہرہ اس کے چلے جانے کے بعد یاد رہتا ہے، پھر جب اس کو بعد میں دیکھتا ہے تو پہچان لیتا ہے (بخاری: ۶۶۰۴، مسلم: ۲۸۹۱ واللفظ لمسلم)۔

ان کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ سے ایک واقعہ کی خبر سنی، اور وقت گذرنے پر اس کو بھول گئے کہ وہ ذہن سے نکل گئی، پھر جب وہ پیش آئی تو ان کو فوراً ویسے ہی یاد آتی جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے بتایا ہوتا، اور وہ اس قسم کی چیزوں کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے: سچ فرمایا میرے خلیل ﷺ نے، جیسے کہ دوسرے بعض صحابہ سے بھی اس قسم کی باتیں منقول ہیں (مسلم: ۱۴۵)۔

جو آدمی واقعات کی گہرائیوں میں غور وفکر سے کام لیتا ہے اور جو احادیث رسول ﷺ کی تفاصیل سے خوب واقف ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کی خبر اور واقع کے درمیان ایسے توافق وتطابق اور ایسے معانی کا ادراک واحساس کرتا ہے کہ جس سے بہت سے وہ لوگ محروم ودور رہتے ہیں جو تأمل سے کام نہیں لیتے، اس لئے کہ اس قسم کی خبر نبوی ایسے منکرات میں پڑنے سے ڈرانے ودور رکھنے کا کام کرتی ہے، اور یہی چیز قدر وشرع کے درمیان حد فاصل اور فرق پر تنبیہ ہے۔

اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ خبر دی کہ آئندہ ایسا ایسا ہوگا، یہ ایک تقدیری امر کی خبر ہے، اور اس میں یہ اشارہ ہوتا ہے کہ شرعی حیثیت سے انسان پر لازم ہے کہ اس قسم کے واقعات کے پیش آنے سے دھوکہ نہ کھائے اور اس کے بارے میں تساہلی نہ برتے اور نہ خطا کاروں کے ساتھ خطا میں پڑے، اور نہ گمراہوں کے ساتھ گمراہی کی راہ پر جائے، اور نہ خلاف شرع راہ پکڑنے والوں کا ساتھ پکڑے اور دلیل یہ دے کہ یہ تو ہونے والا ہی تھا اور ہونے والا ہی ہے۔

بلکہ وہ اس بات کو سمجھے کہ نبی ﷺ نے اس کی خبر اس لئے دی ہے کہ لوگوں کو ڈرایا جائے اور متنبہ کیا جائے تا کہ اہل ایمان صحیح نبوی منہج کو اختیار کریں اور انحراف سے دور رہیں اور خود کو غلط واقع کا ساتھ دینے اور اس کے ساتھ ہم آہنگی کے لئے تیار و آمادہ نہ کریں اور اس طرح وہ دو اچھائیوں کو جمع و حاصل کر لیں۔

ایک تو اس جہت سے کہ جو واقعہ اچانک ان کے سامنے آیا ہے جس کو انہوں نے شریعت سے دور پایا، اس نے ان کو ضیق و اکتاہٹ، گوشہ نشینی اور لوگوں سے دوری، نیز ان کے حق میں بدگمانی پر آمادہ نہیں کیا کہ جس کا اثر ان کی نفسیات و دعوت پر اور داد و دہش پر پڑتا، اس لئے کہ پیش آمدہ واقع سے متعلق رسول اللہ ﷺ کی خبر میں ان کے لئے ایک علمی حصار موجود تھا اور نفسیاتی نمونہ و اسوہ اور مثال بھی۔

اور دوسری جہت یہ کہ اس قسم کے واقعہ کا پیش آنا ان کے لئے ان چیزوں میں پڑنے کا ذریعہ نہیں بنتا جن میں دوسرے لوگ جا پڑتے ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اس کی خبر دے چکے اور یہ بھی بتا چکے کہ یہ خلاف شرع و شریعت ہے، تو اس خبر میں ضمناً یہ اشارہ بھی ہے کہ وہ لوگ اس سے الگ و دور رہیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے امت میں فساد کے وقت صحیح نہج و منہج کو اختیار کرنے والوں کے لئے ثواب عظیم کا تذکرہ فرمایا ہے۔

اس سلسلہ کی معروف ترین احادیث میں یہ مشہور حدیث صحیح ہے:

”للعامل فيهن مثل أجر خمسين رجلاً يعملون مثل عملكم، قيل يا رسول الله!، أجر خمسين منا أو منهم؟ قال: بل أجر خمسين منكم“

(ابوداود: ۴۳۴۱، ترمذی: ۳۰۵۸ واللفظ لہ، ترمذی نے اس کو حسن غریب کہا ہے، ابن ماجہ: ۴۰۱۴، ابن حبان: ۳۵۸، وصححہ عن ابی ثعلبۃ الخشنیؓ)۔

(فتنوں کے زمانے میں شریعت پر عمل کرنے والے کو پچاس آدمیوں کا اجر ملے گا تمہارے عمل کی طرح، صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہم میں سے پچاس کا یا ان میں سے

پچاس کا؟ فرمایا بلکہ تم میں سے پچاس کا اجر ان کو ملے گا)۔

اسی طرح آپ ﷺ کا ایک ارشاد ہے:

"يأتي على الناس زمان الصابر فيهم على دينه كالقابض على الجمر"

(ترمذی:۲۲۶۰،عن انس بن مالکؓ وقال حدیث غریب)۔

(لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ ان کے بیچ رہ کر دین پر صبر کرنے والا اور جمار ہنے والا ایسا ہی ہوگا جیسے کہ ہاتھوں میں انگاروں کو لئے ہوئے ہو)۔

اس حدیث میں ثبات قدمی وصبر کی ترغیب وتاکید ہے، اور یہ آخری درجہ کی چیز ہے جس کی ایک مومن کو طلب ہوتی ہے۔

کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے اندر کمزوری ہوتی ہے تو واقعہ کے تحمل اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل وآلام کے جھیلنے سے وہ عاجز ہو جاتے ہیں اور کبھی ایسا اس کی طبیعت وفطرت کے تحت بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک متفق علیہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! سب سے افضل انسان کون ہے؟ تو فرمایا کہ وہ مومن جو اپنی جان ومال دونوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرے، کہا گیا کہ اس کے بعد؟ فرمایا:

"رجل معتزل في شعب من الشعاب يعبد ربه ويدع الناس من شره"

(صحیح بخاری:۲۷۸۶،صحیح مسلم:۱۸۸۸واللفظ لمسلم)۔

(وہ آدمی جو انسانوں سے الگ تھلگ کسی گھاٹی میں مقیم ہو، وہاں اپنے رب کی عبادت کرتا ہو اور لوگوں کو اپنے شر سے چھوڑ رکھا ہو (یعنی بچاو محفوظ رکھا ہو))۔

اور ایک حدیث میں ہے:

"ليس من الناس إلا في خير" (مسلم:۱۸۸۹عن أبي ہریرةؓ)۔

(ایسا آدمی لوگوں وانسانوں کی نسبت سے خیر وراحت میں ہوتا ہے)۔

ہم نے ابھی اوپر جو بات ذکر کی ہے اس حدیث میں اس کا اشارہ موجود ہے۔

اس حدیث میں پہلے مقام ومرتبہ کا تذکرہ آیا ہے جو اس مومن کا ہے جو اپنی جان ومال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو، اور جہاد کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ تلوار وجنگ کے ذریعہ ہی ہو، کیونکہ جنگ وقتال جہاد سے خاص ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اپنی جان ومال سے جہاد کرے، مال سے جہاد بھی جہاد کی ایک صورت ہے، جس کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں، اللہ کے راستے میں مال کا خرچ کرنا، دعوت اسلام کے راستے میں خرچ کرنا، فقراء ومساکین نیز حاجتمندوں پر خرچ کرنا، اللہ کے راستے میں اور اس کے لئے اللہ کے دشمنوں سے جنگ کرنے والوں پر خرچ کرنا، اسی طرح تعلیم وتعلم بھی جہاد کی ایک شکل ہے، خلاصہ یہ کہ جہاد کی ہر زمان ومکان میں بہت سی صورتیں وشکلیں ہوسکتی ہیں۔

اور تلوار کے ذریعہ جہاد بھی ایک شکل ہے جو موقع ومحل اور اپنے مخصوص شرائط کے مطابق اور ان کے ساتھ اعلی شکل اور اسلام کے سب سے اونچے عمل کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے؟

اور اللہ کے راستے میں مومن کا اپنی جان ومال سے جہاد، مختلف حالات کے مطابق ہوتا ہے اور آدمی اپنی وسعت کے بقدر ہی کوشش کرتا ہے، اور اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے وہ اپنے نفس کو ہی مکلف کرتا اور لگاتا ہے اور اس پر اللہ تعالی نے اپنے پاس جو ثواب کا نظام بنایا ہے وہ اس کی امید وتوقع رکھتا ہے، یہ تو پہلا مقام ومرتبہ ہے۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو اس قسم کے حالات سے ہم آہنگی نہیں کر پاتے تو تنگ دل وتنگ سینہ ہوتے ہیں جب ان کی نظر کسی منکر پر پڑتی ہے تو فوراً ان کا سینہ تنگی کا شکار ہو کر بھڑک اٹھتا ہے اور ایسا آدمی پوری رات اس طرح گذارتا ہے کہ اس کو نیند نہیں آتی، اس قسم کے آدمی کو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے لئے گوشہ نشینی کی کوئی شکل اختیار کرے، لیکن ایسی گوشہ نشینی

نہیں جو کہ مکمل ہو اور آدمی گھر سے دور دراز کسی جگہ چلا جائے، وہیں رات گذارا کرے اور جمعہ وجماعت سب چھوڑ دے، بلکہ ایک حد تک گوشہ نشینی ہو، یوں کہ وہ ان چیزوں سے دور رہے جو اس کے لئے اس قسم کے پر مشقت وتکلیف دہ تاثر کا باعث بنتی ہیں، اور بس ان چیزوں سے تعلق رکھے جن میں اس کے لئے راحت کا سامان ہو، مثلاً جمعہ وجماعت، اسی طرح ذکر کی مجالس میں شرکت، نیز خاص خاص مواقع وتقریبات میں شرکت (جو تنگ دلی کا باعث نہ بنیں) تاکہ نہ خود اس کو تکلیف ہو اور نہ وہ اپنے عتاب اور لعنت وملامت کے ذریعہ دوسروں کے لئے تکلیف کا باعث بنے جس کے نتیجے میں معاملہ عناد وعداوت اور نفرت وکراہت کی حد تک پہنچ جائے۔

علماء کے اختلافات کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے کہ بعض لوگوں کے حق میں یہی بہتر ہوتا ہے کہ وہ علماء کے درمیان پائے جانے والے ہر قسم کے اختلافات سے خود کو الگ رکھیں اور اس میں وہ کسی طرح کا دخل نہ دیں کہ اس کی وجہ سے وہ نفع سے زیادہ نقصان اور صلاح سے زیادہ فساد کا ذریعہ بنیں گے۔

جبکہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ آدمی کسی مسئلہ ومعاملہ میں ایک قول وحکم سے مانوس ہو اور دوسری بات سنے تو وہ اس کو ہضم نہ ہو بلکہ اس کی وجہ سے وہ بھڑک اٹھے، جبکہ یہ بات جو اس کے لئے نئی ہے ہوسکتا ہے کہ اس کی مانوس بات سے کہیں زیادہ قوی اور اس سے فائق وراجح ہو یا یہ کہ اکثر اہل علم اس کے قائل ہوں اور اس کے دلائل بھی صریح وواضح ہوں، لیکن اس نے اس کو سنا نہیں اس لئے وہ اس سے مانوس نہیں بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس قول سے وہ مانوس ہے اور جو اس کا معمول ہے وہ ایسا ہو کہ سرے سے اس پر کوئی شرعی دلیل ہی نہ ہو یا ان عملی بدعات میں سے ہو جن کے لوگ عادی ومانوس ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا ہر قسم کے اختلاف سے علاحدہ ودور رہنا ہی ان کے حق میں بہتر ہوتا ہے اور دوسروں کے حق میں بھی بہتر ہوتا ہے خواہ اختلاف علماء کا

ہو، یا فقہاء واہل افتاء کا، یا داعیان دین یا عامۃ الناس کا، اور یہ اس لئے کہ کسی اختلاف میں اس کا پڑنا اختلاف وانتشار کی آگ کو بھڑکانے کا ذریعہ ہوتا ہے اور پھر اس کا معاملہ ایسا ہوتا ہے جیسے کہ کوئی آدمی آگ میں ایندھن کی لکڑیاں ڈالے۔

علماء کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ اختلاف کے عادی ہوتے ہیں اس لئے اختلاف (عموماً) ان کے دلوں میں کوئی بے جا تاثر اور وحشت پیدا نہیں کرتا، اس سلسلہ کی اہم ترین مثالوں میں وہ حالات ہیں جو حضرات صحابہؓ کی تاریخ واحوال میں محفوظ ومذکور ہیں، وہ بہت سے معاملات میں اختلاف کرتے تھے لیکن بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ ان میں کا کوئی فرد کسی کے حق میں ایسی بات کہے جس سے اس کی تنقیص ہو یا اس کے مقام ومرتبہ میں کمی آئے، وہ زیادہ تر حسن ظن رکھتے تھے، دوسرے کے حق میں عذر کے قائل ومتلاشی ہوتے اور مرکزی چیزوں کو سامنے رکھتے نیز تقوی پر کاربند ہوتے تھے۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ سے جب ان کے اور اہل شام کے اختلاف کی بابت دریافت کیا گیا کہ کیا اس بابت ان کے پاس نبی اکرم ﷺ کی کوئی ہدایت ووصیت ہے؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا:

''رسول اللہ ﷺ نے امارت وحکومت کے متعلق ہم کو کوئی وصیت نہیں فرمائی کہ جس کے ہم پابند ہوں، بلکہ یہ تو رائے ہے جو ہم اپنی طرف سے رکھتے ہیں'' (احمد: ۱/۹۲۱، واللفظ لہ، فضائل الصحابہ: ۷۷۰، السنۃ لابن ابی عاصم: ۱۱۵۸، السنۃ لعبد اللہ بن احمد: ۷/۱۳۲۷، الفتن للمروزی: ۱۹۷، تاریخ دمشق لابن عساکر ۳۰/۲۹۲، نیز ملاحظہ ہو علل دار قطنی ۴/۸۷)۔

دوسری طرف حضرت علیؓ سے ہی خوارج کے متعلق کچھ اور منقول ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے حق میں فرمایا ہے:

"يخرج في هذه الأمة قوم تحقرون صلاتكم مع صلاتهم فيقرؤون القرآن لا يجاوز حلوقهم أو حناجرهم، يمرقون من الدين مروق السهم من

الرمية"(بخاری:۱۹۳۱، ۶۹۳، مسلم:۱۰۶۴ (۱۴۷) عن ابی سعیدؓ)۔

(اس امت میں کچھ لوگ ہوں گے کہ تم ان کی نمازوں کے سامنے اپنی نماز کو حقیر سمجھو گے، حالانکہ وہ قرآن پڑھیں تو قرآن ان کی حلق یا سینوں سے نیچے نہیں جائے گا وہ دین سے اس طرح دور و خالی ہوں گے جیسے کہ تیر (کبھی کبھی) شکار کے جسم کو پار کر کے (بالکل صاف و ستھرا) باہر کو نکل جاتا ہے)۔

اور ایک روایت میں ہے:

"**لئن أدركتهم لأقتلنهم قتل عاد**"(بخاری:۷۴۳۲، مسلم:۱۰۶۴-۱۴۳ عن ابی سعیدؓ)۔

(اگر میں نے ان کو پایا تو قوم عاد کی طرح ان کو ختم و صاف کر دوں گا)۔

اور ایک حدیث میں آیا ہے:

"**فإذا لقيتموهم فاقتلوهم فإن في قتلهم أجراً لمن قتلهم عند الله تعالى**"(بخاری:۶۹۳۰، مسلم:۱۰۶۶، واللفظ لہ عن علی بن ابی طالبؓ)۔

(تم لوگوں کو جب وہ ملیں تو ان کو قتل کر دینا کہ ان کے قتل میں اللہ تعالی کے نزدیک ان لوگوں کے لئے اجر ہے جو ان کو قتل کریں گے)۔

آپ نے ان کے تذکرہ و احوال میں اس شخص کا بھی تذکرہ کیا ہے جس کا ہاتھ پستان کی شکل کا بتایا حتی کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ نے (جنگ کے بعد) مقتولین کی لاشوں میں ایسے شخص اور اس کی لاش کو تلاش کرنے کا حکم فرمایا، لوگوں نے جستجو کی مگر اس کو نہ پا سکے تو فرمایا: واپس جاؤ کہ بخدا نہ تو میں نے غلط کہا ہے اور نہ ہی مجھ سے غلط کہا گیا ہے، بہر حال اس کے بعد جب لاشیں اٹھائی گئیں تو (ایک جگہ) لاشوں کے نیچے وہ شخص ملا، حضرت علیؓ نے فرمایا: "**صدق الله ورسوله**"(ملاحظہ ہو: مسند احمد:۶۷۲، مسلم:۱۰۶۶، البدایہ والنہایہ ۱۰/ ۵۹۲،۴،۷)۔

حضرت علیؓ نے خوارج سے جو جنگ نبی اکرم ﷺ کی وصیت و عہد کی وجہ سے کی تھی،

اس کے درمیان اور اہل شام وصفین سے جو ان کی جنگ ہوئی اس کے درمیان فرق کیا کہ یہ جنگ رائے واجتہاد کی بنیاد پر تھی اور اہل صفین کے ساتھ جنگ میں ان کا انداز ومعاملہ مختلف رہا کہ نہ تو ان کے زخمیوں کے درپے ہوئے اور نہ ان کے اموال پر قبضہ کیا، نہ ہی ان کی عورتوں کو قید کیا، حتی کہ جب ان کے ساتھ کے خوارج نے کہا کہ جب ان (اہل صفین وشام) کا خون ہمارے لئے جائز ہے تو ان کا مال اور ان کی عورتیں ہمارے لئے کیوں نہیں جائز ہیں؟ کہ اگر یہ کافر ہیں تو ان کی عورتوں کو قید کرنا جائز ہے اور اگر یہ مسلمان ہیں تو ان سے جنگ کرنے سے رکنا ضروری ہے، اور خوارج کا معاملہ یہ تھا کہ وہ ہمیشہ اسی قسم کے سطحی قیاس سے کام لیا کرتے تھے۔

ان کی اس قسم کی باتوں کا حضرت علیؓ نے یوں علمی جواب دیا کہ بتاؤ تم میں سے کوئی حضرت عائشہؓ کو اپنے حصہ میں لے گا؟ تو انہوں نے کہا کہ ام المؤمنین کو کون اپنے حصہ وقبضہ میں لے گا؟ (ملاحظہ ہو: مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۷۸۰، تاریخ دمشق: ۲۸۶/۳۰، ۲۸۷، جامع بیان العلم وفضلہ: ۱۸۳۵، البدایہ والنہایہ ۱۰/۴۷۰)۔

یہی راز ہے کہ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ تعالی اور ان کے درمیان جو اختلاف رائے تھا وہ ان کے لئے آپس کی مودت ومحبت، ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنا، ایک دوسرے سے سننا وسنانا اور ایک دوسرے کی تعریف، اس سب سے مانع نہیں بنا۔

یہ فقہ وادب کا ایک عظیم الشان باب ہے جو یہ سکھاتا و بتاتا ہے کہ اختلاف کو بڑا مت بناؤ یا یہ کہ اس میں ایسا مبالغہ نہ کرو کہ جس کے نتیجہ میں ایمانی اخوت پارہ پارہ ہو جائے، اور علماء کا اختلاف شریعت کے فروعی مسائل میں تو ہے لیکن اس پر وہ قطعی طور پر متفق ہیں کہ اہل ایمان کی آپس میں محبت واجب ہے، اور اس پر قطعیت کے ساتھ متفق ہیں کہ اہل ایمان میں آپس میں ایک دوسرے سے بغض حرام ہے، اور اس پر متفق ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان حسد وعداوت حرام ہے، اور اس پر متفق ہیں کہ اہل ایمان کی ایمانی اخوت ایسا مضبوط بندھن ہے جو ایمان کے زوال

کے ساتھ ہی ختم ہوسکتا ہے اگر چہ اس اخوت میں ایمان کی قوت وضعف کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے، اس کے حق میں بھی جس سے محبت ودوستی ہو اور اس کے حق میں بھی جس کی طرف سے محبت ودوستی ہو۔

جیسے کہ علماء اس پر متفق ہیں کہ جو حقوق کتاب وسنت میں منصوص ومصرح ہیں ان کی حفاظت لازم ہے، اور اس پر بھی متفق ہیں کہ فریضہ اخلاقیات کا معاملہ تمام انسانوں کے ساتھ لازم ہے، لہٰذا یہ قطعیات جو اہل توحید کے درمیان محل اتفاق ہیں ان کے ساتھ اختلافی جزئیات وفرعیات کو ٹکرانا نہیں چاہئے۔

اس بات سے دل کو بڑا صدمہ ورنج ہوتا ہے کہ ایک جوان اپنا وقت اسی قسم کی چیزوں کی جستجو میں لگاتا ہے اور اختلاف کی آگ کو بھڑکاتا اور اس کو ایندھن پہنچاتا ہے، اور اس کا کل واصل مشغلہ یہ ہوتا ہے کہ فلاں نے یہ کہا اور فلاں نے یہ جواب دیا، جبکہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

"لا يدخل الجنة نمام" (مسلم:۱۰۵، ۱۶۸، عن حذیفہؓ)، وفي رواية "قتات" (بخاری:۶۰۵۶، مسلم:۱۰۵، ۱۶۹، عن حذیفہؓ) (جنت میں چغل خور داخل نہیں ہوگا)۔

اس حدیث میں اس قسم کی بات کو ادھر سے ادھر نقل کرنے کی اہمیت کیا ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔

تم ایک آدمی کو دیکھو گے کہ وہ کسی سے کہتا ہے کہ فلاں نے تمہارے بارے میں یہ کہا ہے، اور پھر دوسرے (فلاں) کے پاس جا کر کہتا ہے کہ فلاں تمہارے بارے میں یہ کہتا ہے اور اگر تم جستجو وتحقیق کرو تو پتہ چلے گا کہ کسی نے کچھ نہیں کہا یا یہ کہ نقل کرنے والے سے سمجھنے میں چوک ہوئی ہے یا یہ کہ اس نے زیادتی ومبالغہ سے کام لیا ہے اور اگر کہنے والے نے کچھ کہا بھی ہو تو اس کو اس طرح نقل کرنے اور اس کے دائرہ کو بڑھانے وپھیلانے کا حق نہیں ہوتا۔

لہذا انسان پر لازم ہے کہ اس بات سے بہت بچے کہ لوگوں میں عوام کے درمیان یا علماء وفقہاء کے درمیان کوئی فتنہ پیدا کرے، بلکہ اس کا فرض تو یہ ہے کہ ایسی باتوں کو ختم کرنے اور کم کرنے وہلکا کرنے کا ذریعہ بنے اور دلوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کا کام کرے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

"ليس الكذاب الذي يصلح بين الناس فينمي خيراً أو يقول خيراً"

(بخاری: ۲۶۹۲، واللفظ لہ، مسلم: ۲۶۰۵، عن ام کلثوم بنت عقبہؓ)۔

(وہ آدمی جھوٹا نہیں جو لوگوں کے درمیان صلح کرنے وکرانے کے لئے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر خیر کی بات کرتا و پہنچاتا ہے)۔

تم کسی آدمی کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ فلاں تمہارا ذکر خیر کر رہا تھا اور اس کے حق میں کوئی کلمۂ خیر جو کسی نے کہا ہو ذکر و نقل کرو، پھر اس سادی سی بات کے لئے ایک اچھا و مناسب ماحول تیار کرو اور اس کے ساتھ اگر تکدر کی کوئی بات رہی ہو تو اس کو الگ کر دو، تو تم اس حال وعمل میں جھوٹ کے مرتکب نہیں ہو گے، بلکہ تم نے اس صورت میں اصل بات کو گویا بین القوسین کر دیا اور آگے و پیچھے کچھ مناسب چیزیں لگا دیں ور کھ دیں، اور اس طرح تم نے اس کے لئے ایک مقدمہ وخاتمہ ترتیب دیا جس نے اس کو نفس الامر میں ایک بڑائی عطا کر دی اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کا اثر کہیں زیادہ ہو گا، اور اس سے آدمی کا سینہ بھی منشرح ہو گا اور دل بھی مطمئن و مسرور ہو گا۔

اختلاف تو ایک تقدیری امر ہے جو پیش آ کے رہے گا، اور دلیل حق تعالی کا ارشاد ہے:

"ولو شاء ربک لجعل الناس أمة واحدة ولا يزالون مختلفين إلا من رحم ربک ولذلک خلقهم" (ہود: ۱۱۸-۱۱۹)۔

(اور اگر آپ کے رب کو منظور ہوتا تو سب آدمیوں کو ایک ہی طریقہ کا (یعنی سب کو

مومن) بنا دیتے اور (آئندہ بھی یہ) اختلاف کرتے رہیں گے مگر جس پر آپ کے رب کی رحمت ہو اور اس نے ان لوگوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے)۔

یہ آیت اختلاف کے وجود کو بتاتی ہے اور یہ کہ حق تعالی اس پر قادر ہیں کہ سارے انسانوں کو ایک امت، حق و ہدایت پر رکھیں لیکن اس نے سارے انسانوں کو ایسی طبیعت وفطرت کے ساتھ پیدا فرمایا ہے کہ ان کے اندر ہدایت وگمراہی، خیر وشر اور خطاً وصواب کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھی ہے، ارشاد ہے:

"ونفس وما سواها فألهمها فجورها وتقواها" (الشمس:۷-۸) (اور قسم ہے انسان کی جان کی اور اس ذات کی جس نے اس کو درست بنایا اور پھر اس کی بدکرداری و پرہیزگاری دونوں کا اس کو القاء کیا)۔

اسی وجہ سے انسانوں میں (ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں) نیک و بد، مومن وکافر، متقی وفاجر، راہ یاب وگمراہ، خطا کار ونیکوکار، سب ہی پائے جاتے ہیں۔

یہ ایک عام قاعدہ ہے جس کا انسانوں کی عام فطرت سے تعلق ہے، اور یہ فی الجملہ تمام مسلمانوں کو بھی شامل ہے یہی وجہ ہے کہ تم مسلمانوں میں ایمان کی رو سے قوی وضعیف، دونوں پاؤ گے، اور ان میں عالم وجاہل، راہ یاب وگمراہ، متبع سنت اور سنت سے دور وبیزار، ہدایت یافتہ وگم کردۂ راہ، اور خطا کار و درست کار سب ہی ہیں۔

اور خلاصہ یہ کہ اختلاف کو جڑ سے مٹانا اور ختم کر دینا ممکن نہیں ہے، اس لئے جو لوگ یہ سوچتے اور خواب دیکھتے ہیں کہ امت ایک جیسی، ایک نہج ورخ کی ہو جائے، سب کے دل ایک آدمی کا دل رکھیں ان میں باہم کوئی وکسی قسم کا اختلاف نہ ہو، سب کے سب حق پر اور قول راجح یا صحیح ومختار قول پر ہوں، وہ ایسی چیز کا خواب دیکھتے ہیں، جس کا وجود ممکن نہیں ہے، اور جو پوری تاریخ اور گذرے ہوئے زمانے میں نہیں ہو سکی، اس لئے کہ دن بدن حالات میں شدت پیدا

ہوتی جارہی ہے، اور باہمی اختلاف کا دائرہ برابر بڑھتا و پھیلتا جارہا ہے۔

سنن ومسانید وغیرہ میں متعدد طرق سے صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت سے روایت نقل کی گئی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

"افترقت اليهود على إحدى أو ثنتين وسبعين فرقة وتفرقت النصارى على إحدى أو ثنتين وسبعين فرقة، وتفترق أمتي على ثلاث وسبعين فرقة"

(احمد: ۸۳۷۷، ۱۲۵۰۱، ۱۶۹۷۹، ابوداؤد: ۴۵۹۶، ۴۵۹۷، ترمذی: ۲۶۴۰، ۲۶۴۱، ابن ماجہ: ۳۹۹۱، ۳۹۹۳)۔

(یہودی اکہتر یا بہتر فرقوں میں بٹے، اور نصاریٰ بھی اکہتر یا بہتر فرقوں میں بٹے اور میری امت تہتر فرقوں میں ہو جائے گی)۔

اور ایک روایت میں ہے:

"كلها في النار إلا واحدة" (احمد: ۱۲۹، ۱۶۹۷۹، ترمذی: ۲۶۴۱، ابن ماجہ: ۳۹۹۱، ۳۹۹۳، تفصیل کے ساتھ تخریج کے لئے ملاحظہ ہو: صفۃ الغرباء ۲/ ۲۰-۵۱)۔

(یہ سارے فرقے (میری امت کے) جہنم میں جائیں گے، بجز ایک کے (کہ وہ جنت میں جائے گا)۔

اولاً تو آپ نے یہ ذکر فرمایا کہ سب کے سب اسی امت کے ہوں گے، اس میں اشارہ ہے کہ یہ ۷۳ فرقے کل کے کل مسلمان ہوں گے، کیونکہ ان فرقوں کو اس امت سے شمار کیا ہے، لہذا وہ سب مسلمان ہی ہوں گے، البتہ ان میں سے کچھ راہ حق وصواب سے دور ہوں گے (ملاحظہ ہو: مجموع الفتاوی لابن تیمیہ ۷/ ۲۱۷، اور تفصیل کے لئے صفۃ الغرباء ۲/ ۶۲ وما بعد)۔

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد: سب کے سب جہنم میں ہوں گے بجز ایک کے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں جائیں گے، بلکہ مراد یہ ہے کہ حق تعالی کی طرف سے سزا کے مستحق ہوں گے، اور ان میں سے بعض کو سزا وعذاب ہوگا اس کے بعد ان کو جہنم سے نکال لیا

جائے گا۔

جیسا کہ اللہ تعالی کا معاملہ تمام اہل توحید مسلمانوں کے ساتھ ہوگا، اگرچہ انہوں نے بعض گناہوں ومعاصی کا ارتکاب کیا ہو۔

یہ حدیث دوسری بہت سی ان احادیث کی طرح ہے جو مختلف اسباب کی وجہ سے وعید پر مشتمل ہیں اوران کا مدلول مختلف لوگوں: افراد و جماعتوں پر صادق آتا ہے اوراس قسم کے مضمون کی یہ اکیلی حدیث نہیں ہے، بلکہ اور بھی احادیث ہیں جیسے نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد:

"أمتي هذه أمة مرحومة ليس عليها عذاب في الآخرة، عذابها في الدنيا الفتن والزلازل والقتل" (مسند احمد: ۱۹۶۹۳، ابوداود: ۴۲۷۸ واللفظ لہ، ابن ماجہ: ۴۲۹۲، ابویعلی (۷۲۷۷)، الحاکم: ۴/۴۹۱، القضاعی فی مسند الشہاب: ۹۶۸ عن ابی موسی الاشعریؓ)۔

(میری یہ امت، امت مرحومہ ہے، اس پر آخرت میں کوئی عذاب نہیں ہوگا، اس کا عذاب دنیا میں ہے اور فتنوں، زلزلوں اور قتل کی شکل میں ہے)۔

اس حدیث میں اس تکوینی معمول ودستور کی طرف واضح اشارہ موجود ہے جس کا ہم نے تذکرہ کیا ہے کہ یہ امت افتراق واختلاف میں پڑے گی اور ضرور پڑے گی۔

(۲)

اختلاف اور حضرات صحابۂ کرام وعلماء امت اور ان کا معمول

صحابہ کے اختلاف کی بابت جن حضرات نے بھی لکھا ہے انہوں نے اس کے نمونہ میں ایک واقعہ کا عموماً تذکرہ کیا ہے جو غزوہ بنی قریظہ کے موقع سے نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں پیش آیا اور جس کا باعث نبی اکرم ﷺ کا وہ حکم بنا جو آپ نے ان کو غزوہ احزاب کے بعد دیا تھا:

"لا يصلين أحد العصر إلا في بني قريظة" (اس کی تخریج گذر چکی ہے)

(عصر ہر آدمی کو بنو قریظہ میں ہی پڑھنی ہے)۔

اور یہ معلوم ہے کہ بنو قریظہ کے مکانات مدینہ سے دور نہیں تھے، بلکہ مدینہ کے اطراف میں تھے، صحابہ اس ارشاد کی بجا آوری کی بابت دو حصوں میں ہو گئے، ایک جماعت کی رائے یہ ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو صاف وصریح اور قطعی حکم دیا ہے کہ عصر ہم بنو قریظہ میں ہی پڑھیں، تو انہوں نے کہا کہ ہم تو بنو قریظہ میں پہنچ کر ہی نماز عصر ادا کریں گے، اگر چہ اس کی وجہ سے عصر کا وقت چلا کیوں نہ جائے، ویسے تو سمجھ میں یہ آتا ہے- واللہ اعلم- کہ بنو قریظہ کے مکانات تک پہنچنے سے پہلے عصر کا وقت ختم نہ ہوتا کیونکہ بنو قریظہ کے مکانات مدینہ سے اتنی دور نہ تھے کہ وہاں تک ان کا پہنچنا وقت کے نکلنے کے بعد ہوتا، تو ہو سکتا ہے کہ یہ مراد ہو کہ عصر کا مستحب وقت جو اصفرار (سورج کے زرد پڑنے تک) رہتا ہے، وہ نکل جائے۔

اور دوسری جماعت کا کہنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا مقصد بنو قریظہ تک جلد از جلد پہنچنا

ہے اور یہ مقصد نہیں کہ عصر وہیں پہنچ کر ادا کی جائے، اس لئے کہ اس کا کوئی نفع نہیں ہے، اس وجہ سے ان لوگوں نے راستے میں ہی وہاں پہنچنے سے پہلے ہی عصر کی نماز ادا کر لی۔

نبی اکرم ﷺ کے کسی فرمان کو سمجھنے میں صحابہ کرامؓ کے اختلاف کے واقعات میں یہ سب سے معروف واقعہ ہے۔

اس اختلاف کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حضور ﷺ کے زمانہ میں ہوا، اور آپ کے دیکھنے وسننے میں ہوا، اور اس پر ایک عملی نتیجہ مرتب ہوا اور سامنے آیا۔

تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان آج تک جو فقہی اختلاف پایا جاتا ہے، صحابہ کرامؓ کے اس اختلاف نے، اس کی اولین بنیادیں واساسیں قائم کی ہیں؟

کیونکہ اسلام کے فقہی مدارس اجمالی طور پر دو بنیادی مدرسوں میں منقسم ہیں۔

پہلا مدرسہ: پہلا مدرسہ تو وہ ہے جس کو ہم ''مدرسۂ نص اور مدرسہ ظاہر'' کہہ سکتے ہیں، یہ وہ مدرسہ ہے جو نص کی حرفیت وظاہریت کو پکڑتا ہے، اور اسی پر نگاہ رکھتا ہے، حتی کہ اس مدرسہ کے بعض حضرات شریعت میں تعلیل، علت کی بنیاد پر حکم کی توسیع وقیاس کا بھی انکار کرتے ہیں اور اس کو نہیں مانتے، اور اس حلقہ کے بعض حضرات میں تشدد بھی ہے جیسے ابن حزم اور ان سے پہلے داؤد اصفہانی اور بعض لوگ اس قسم کا مزاج نہیں رکھتے۔

دوسرا مدرسہ: دوسرا مدرسہ ''مدرسہ مقاصد'' ہے، یہ مدرسہ شریعت کے مقاصد اور احکام کی تعلیل کو اہمیت دیتا ہے اور ساتھ ہی نص کی رعایت وخیال اس طور پر کرتا ہے کہ اس سے ٹکراؤ ومخالفت نہ ہو، اور یہ مقاصد کا استحضار واستعمال بھی ان خاص نصوص کے حق میں ہوتا ہے، جو بظاہر متعارض ہوں، یا پھر کوئی اہم مصلحت سامنے ہو جو کسی مرجوح نص کو ترجیح دینے کا تقاضا کرے، یا کسی ضعیف قول کو اپنانے واختیار کرنے کا یا اس بات کا کہ بعض نصوص کے سیاق کو نئے سرے سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اسلام کے مشہور فقہی مدارس و مکاتب انہیں دونوں مدارس یا نقطہائے نظر میں بٹے ہوئے ہیں، جبکہ فقہاء وعلماء میں کچھ لوگ ایسے بھی ملیں گے کہ جو دونوں کو لے کر چلتے ہیں۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ دو مدرسے و نقطہائے نظر صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسی اختلاف سے پیدا ہوئے جو عہد نبوی ﷺ میں آپ کے ارشاد مذکور کو سمجھنے کی بابت ہوا اور آپ نے اس اختلاف کو ختم نہیں فرمایا، اس لئے کہ نہ تو کسی فریق کو کچھ برا کہا اور نہ ہی یہ فرمایا کہ اس واقعہ و معاملہ اور اختلاف میں دونوں میں سے کونسی جماعت صائب الرائی تھی۔

اور صحابہ کے اختلافات اس سے بھی آگے بڑھ کر آئے ہیں، جیسے حضرت عمر بن خطابؓ کی رائے اس بابت کہ انہوں نے قحط سالی کے حال میں چوری کی حد وسزا ساقط کردی (ملاحظہ ہو: مصنف عبد الرزاق: ۱۸۹۹۰، موطا مالک: ۱۴۳۶، مسند شافعی ۱/ ۲۲۴، محض الصواب فی فضائل عمر بن الخطاب ۱/ ۳۲۳، وفصل الخطاب فی سیرۃ عمر بن الخطاب للدکتور علی بن محمد صلابی ۳۲۱، ۳۲۳، ۳۹۹، ۴۰۰)۔ اسی طرح انہوں نے مؤلفۃ القلوب کو زکوۃ سے حصہ دینے سے انکار کیا (ملاحظہ ہو: فصل الخطاب فی سیرۃ عمر بن الخطاب للدکتور علی بن محمد صلابی: ۳۶۷)۔

اہل کتاب عورتوں سے نکاح کو منع کیا (ملاحظہ ہو: مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۶۱۶۳، وتفسیر طبری ۲/ ۳۷۸، سنن بیہقی کبری ۷/ ۱۷۲)۔

اس کے علاوہ بھی بعض چیزیں ہیں جو حضرت عمرؓ کی فقہ راشدی کی مضبوط فقاہت کے نمونے ہیں (ملاحظہ ہو: موسوعۃ فقہ عمر بن الخطاب، محض التوثیق فی سیرۃ وحیاۃ الفاروق، عمر بن الخطاب لعبد الرحمن البکری، فصل الخطاب فی سیرۃ عمر بن الخطاب للدکتور علی بن محمد الصلابی)۔

اور ایک عجیب بات ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب صحابہ کی دو جماعتوں کے اختلاف کا ذکر کیا اور اپنی نبوت کے دلائل کے طور پر اس اختلاف کے وجود اور دونوں جماعتوں کے ساتھ

خوارج کے معاملہ کا ذکر کیا، تو فرمایا:

"یقتلها أولی الطائفتین بالحق" (مسلم: ۱۰۶۴، ۱۵۰ عن ابی سعید الخدریؓ)۔

اور ایک روایت میں ہے:

"یقتلهم أدنی الطائفتین بالحق" (مسلم: ۱۰۶۴، ۱۴۹ عن ابی سعید الخدریؓ)۔

اور ایک میں ہے:

"یقتلهم أقرب الطائفتین من الحق" (مسلم: ۱۰۶۴، ۱۵۳ عن ابی سعید الخدریؓ)۔

(اور ان سب کا مفہوم یہ ہے کہ خوارج کو صحابہ کی دونوں جماعتوں میں سے وہ جماعت قتل کرے گی جو اقرب الی الحق ہوگی)۔

یہ حدیث یہ بتاتی ہے کہ مذکورہ اختلاف میں (جو حضرات علی و معاویہؓ کے درمیان تھا) حق سے قریب و موافق حضرت علیؓ اور ان کے رفقاء تھے، اسی لئے عام علماء اسلام کے نزدیک راجح قول یہی ہے کہ حضرت علیؓ اور ان کے رفقاء - صحابہؓ و دوسرے - اہل شام کے مقابلے میں حق سے اقرب اور حق سے زیادہ موافق تھے، اور یہ کہ اہل شام کا فریضہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ کے ساتھ ہو جاتے اور ان سے بیعت ہوتے، اس لئے کہ وہ امیر المومنین اور چوتھے خلیفہ راشد تھے۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ دونوں جماعتوں میں حق سے اقرب واوفق وہ جماعت ہے جو خوارج کو قتل کرے گی، اگرچہ بعض علماء کا رجحان ہے کہ اس اختلاف میں جو لوگ جنگ سے الگ رہے وہ ان لوگوں سے افضل ہیں جو جنگ میں لگے رہے، اور اس طرح ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ ہم یہ کہیں کہ مذکورہ اختلاف میں صحابہؓ تین گروہوں و جماعتوں میں منقسم تھے:

پہلی جماعت: اہل عراق جنہوں نے حضرت علیؓ کے ساتھ مل کر جنگ کی۔

دوسری جماعت: اہل شام جنہوں نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ مل کر جنگ کی۔

تیسری جماعت: وہ حضرات جو آپسی اختلاف سے بالکل الگ رہے، اور جنگ سے دور رہے، اور یہ بھی کافی تھے، جیسے عبداللہ بن عمرؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، محمد بن مسلمہؓ، اسامہ بن زیدؓ، اور بہت سے اجلۂ صحابہ رضی اللہ عنہم، یہ لوگ جنگ سے الگ رہے اور جنگ میں نہ حضرت علیؓ کے ساتھ رہے اور نہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ، اگرچہ یہ الگ رہنے والے حضرات بھی یہ سمجھتے و مانتے تھے کہ حضرت علیؓ فی الجملہ حق سے قریب ہیں، لیکن یہ لوگ جنگ کو درست نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ یہ جنگ مسلمانوں کے درمیان تھی جس پر تاریخ میں بہت سے بڑے بڑے سلبی آثار مرتب ہوئے۔

یہاں اس حدیث و تفصیل کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس واقعہ کا تذکرہ اور اس میں اقرب الی الحق واوفق بالحق کا ذکر بھی فرمایا اور اس وقت جبکہ یہ واقعہ پیش بھی نہیں آیا تھا، اور جبکہ بنوقریظہ والے قضیہ میں آپ نے اس کا تذکرہ نہیں فرمایا کہ حق سے اقرب کونسا فریق رہا حالانکہ وہ واقعہ آپ کے سامنے پیش آیا۔

اس کی وجہ۔ ویسے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، مگر ہماری سمجھ سے۔ یہ ہے کہ دونوں واقعات و معاملات میں کئی وجوہ سے فرق ہے، عظمت، اہمیت، وسعت اور اثر اندازی، ان وجوہ و امور کا دونوں میں فرق ہے (کہ بنوقریظہ کا معاملہ اتنا بڑا و اہم اور دوررس اثرات والا نہیں تھا جیسا کہ دوسرے واقعہ و حال کا تھا اور رہا)۔

جیسے کہ وہ قصہ جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کو کہیں بھیجا، تو نماز کا موقع آنے پر جب پانی نہیں ملا، تو دونوں نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی، اس کے بعد ان کو پانی مل گیا اور ابھی نماز کا وقت باقی تھا، تو ایک صاحب نے یہ کیا کہ وضو کر کے نماز کو دوبارہ ادا کیا، اور دوسرے صاحب نے اپنی سابق نماز کو کافی سمجھا اور اس پر اکتفا کی، حضور ﷺ کی

خدمت میں جب دونوں آئے اور اپنے حالات کا تذکرہ کیا تو آپ نے وضو کر کے دوبارہ نماز ادا کرنے والے سے فرمایا کہ تم کو دوہرا اجر ملا، اور دوسرے صاحب سے فرمایا کہ تم نے سنت پر عمل کیا اور تمہاری نماز ہوگئی (ابوداؤد: ۳۳۸، واللفظ لہ، نسائی: ۴۳۳، حاکم ۱/۲۸۶ عن ابی سعید الخدریؓ)۔

اب اس واقعہ میں رسول اللہ ﷺ کے قلب وذہن کی وسعت کو دیکھئے کہ جو اختلاف اجتہاد کی بنیاد پر تھا آپ نے اس کو برقرار رکھا، اس کی تائید کی اور دونوں میں سے کسی کو بھی برا نہ کہا۔

اگر یہی واقعہ متعصب فقہاء کے سامنے آئے تو وہ بھڑک اٹھیں گے، اور ہوسکتا ہے کہ دوبارہ نماز پڑھنے والے سے کہیں کہ تم نے ایک وقت میں اور ایک وقت کی نماز کو دو مرتبہ ادا کیا، یہ غلط ہے۔ اللہ عزوجل نے تو پانچ ہی نمازیں رکھی ہیں اور تم نے چھ کردیں، اور اس کے بعد اس کے اس فعل کے بہت سے لوازم وعواقب کا ذکر کر کے اس کو لعنت وملامت اور توبیخ وسرزنش کریں گے۔

جبکہ رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ نماز پڑھنے والے سے فرمایا کہ تم کو دوہرا اجر ملا، اور ایک ہی مرتبہ نماز پر اکتفا کرنے والے سے فرمایا کہ تم نے سنت پر عمل کیا اور تمہاری نماز ہوگئی، یہ دلیل ہے کہ دوسرے کا عمل حق واقرب الی الحق تھا، اس لئے کہ نماز ہوگئی تو اس کو دوبارہ ادا کرنے کا کوئی داعی وباعث نہیں رہ گیا، اور ایک وقت میں، ایک ہی نماز دو مرتبہ نہیں ہوتی۔

دوسری طرف بنوقریظہ والے واقعہ میں آپ نے خطا کار ونیکوکار کی کوئی وضاحت نہیں فرمائی، اسی لئے بعد میں علماء کے درمیان اختلاف ہوا ہے کہ آخر ان دونوں فریقوں میں کون زیادہ صائب وٹھیک تھا؟ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ راستے میں نماز پڑھنے والے، اس لئے کہ انہوں نے نماز کو وقت پر ادا کرنے کا اہتمام کیا اور ساتھ ہی بنوقریظہ تک جلد از جلد پہنچنے کا بھی

التزام کیا۔

اور بعض حضرات کی رائے ہے کہ حق ان کے ساتھ ہے جو بغیر تاخیر وتوقف کے بنوقریظہ کے لئے چلتے رہے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے نماز ادا کی، اس لئے کہ انہوں نے امر نبوی ﷺ کے ظاہر کا پورا لحاظ کیا۔

اس واقعہ وعمل کی بابت علماء کے درمیان یہ اختلاف ہوا جو آج تک ہے اور آئندہ بھی رہے گا، اور اگر ہم اس قسم کا مسئلہ اس وقت کے اکابر علماء کے سامنے پیش کریں تو ان کے درمیان یہ اختلاف ضرور سامنے آئے گا کہ دونوں میں سے کونسی جماعت زیادہ صائب ودرست تھی۔

نبی اکرم ﷺ کے بعد صدر اول -عہد صحابہ- میں پائے جانے والے اختلاف کو گننا وشمار کرنا ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ اس کی ایک لمبی فہرست وبڑی تعداد ہے، بطور نمونہ ہم بعض کا تذکرہ کررہے ہیں:

مثلاً حضرت عمرؓ کہ بہت سے مسائل میں (عام صحابہ سے مختلف) ان کی خاص آراء تھیں جیسے زکاۃ میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ (تخریج گذر چکی ہے)، طلاق کا مسئلہ کہ انہوں نے تین طلاق جو ایک مانی جاتی تھی اس کو تین کردیا (ملاحظہ ہو: صحیح مسلم: ۲/۱۴۷۲، فصل الخطاب فی سیرۃ عمر بن الخطاب للصلابی: ۴۱۰، ۴۱۳)۔ ایسے ہی کلالہ کی بابت ان کی خاص رائے تھی وہ فرماتے تھے کہ اگر میں زندہ رہا تو میں اس بابت ایسا فیصلہ کردوں گا کہ جس کو سب مانیں گے اور سب اس کا اعتبار کریں گے جو قرآن پڑھنے والے اور سمجھنے والے ہیں وہ بھی اور جو قرآن کریم کو پڑھنے وسمجھنے سے تعلق نہیں رکھتے وہ بھی (مسند احمد: ۸۹، مسلم: ۱۶۱۷، واللفظ لہ، نسائی، سنن کبری: ۵: ۱۱۱۳۵)۔

جیسے کہ ان کے معروف ومعتمد اقوال میں یہ بھی ہے کہ مسافر کو اگر جنابت لاحق ہو اور اس کو پانی نہ ملے تو وہ تیمم نہیں کرے گا (تاکہ نماز پڑھے)، چاہے جتنا وقت گذر جائے جب اس

کو پانی ملے گا تو غسل کر کے ہی نماز ادا کرے گا (ملاحظہ ہو: مسند احمد: ۱۸۳۵۸، صحیح بخاری: ۳۴۸، مسلم: ۳۶۸، سنن نسائی: ۳۱۹، سنن ابن ماجہ: ۵۶۹)۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا آدمی اگر دس سال یا زائد مدت تک پانی نہ پائے تو نماز نہیں پڑھے گا، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ان کے اس قول میں ان کے مؤید و موافق تھے (ملاحظہ ہو: مسند احمد: ۱۸۳۵۶، صحیح بخاری: ۳۴۵)۔

ان دونوں حضرات کی اس رائے کے خلاف صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم سے حجت پکڑی کہ حق تعالی نے سورہ مائدہ میں فرمایا ہے:

"وإن كنتم مرضى أو على سفر أو جاء أحد منكم من الغائط أو لٰمستم النساء" (المائدہ: ٦) (اور اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص استنجے سے آیا ہو یا تم نے بیویوں سے قربت کی ہو)۔

اور راجح یہ ہے کہ اس آیت میں ملامست کے لفظ سے جماع مراد ہے، اس لئے کہ اگر اس سے مقصود محض عورت کے جسم کو ہاتھ لگانا ہوتا تو اس آیت میں اس کے ذکر کی ضرورت ہی نہ تھی، کیونکہ أو جاء أحد منكم من الغائط (یا تم میں سے کوئی استنجے سے آیا ہو) کا لفظ اس مفہوم کو بھی کافی تھا، اس لئے کہ اس سے مراد و مقصود حدث اصغر ہے (اور عورت کے جسم کو ہاتھ لگانا بھی حدث اصغر کے قبیل کی چیز ہے)۔

ابن مسعودؓ نے -صحابہ کے جواب میں- فرمایا کہ اگر ہم ان کو اس میں رخصت دینے لگے تو یہ ہوگا کہ جہاں کوئی آدمی پانی کو ٹھنڈا محسوس کرے گا وہ پانی (وضو) کو چھوڑ دے گا اور تیمم کرلے گا (بخاری: ۳۴۶)۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ لوگ اس رخصت پر عمل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں توسع برتیں گے محض اس بنیاد پر کہ پانی کو کچھ ٹھنڈا پائیں و محسوس کریں گے۔

حضرت عمر و ابن مسعودؓ کا اختیار کردہ یہ قول ضعیف ہے اور ظاہر قرآن کے خلاف ہے،

بلکہ سنت نبویہ کے بھی خلاف ہے، بعد کے زمانہ میں اس کے خلاف پر اجماع بھی ہو گیا (ملاحظہ ہو: المغنی ۱/۶۱، تفسیر القرطبی ۶/۱۰۴، المجموع ۲۱/۲۳۹، أضواء البیان ۱/۳۵۸)۔

امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کے اس اجتہادی قول کو جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم نے قبول نہیں کیا حالانکہ ان کی شخصیت ان کے درمیان اور ان کے لئے باعظمت و پر ہیبت تھی حتی کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ جیسا آدمی - فرائض کے مسئلہ عول میں اپنی رائے کے حق میں - ان کی حیات تک خاموش رہا اور ان کی وفات کے بعد انہوں نے اس کا برملا اعلان و اظہار کیا، اور جب اس بابت ان سے کہا گیا کہ پہلے آپ نے کیوں نہ ذکر کیا، تو فرمایا کہ حضرت عمرؓ ایک باہیبت آدمی تھے، میں ان کی ہیبت میں تھا (ملاحظہ ہو: سنن بیہقی کبری ۶/۲۵۳، المغنی ۶/۱۷۴، ۱۷۵)۔

اب دیکھئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کس طرح دونوں پہلوؤں کو جمع کیا۔

ایک طرف تو ایک ضعیف قول کو قبول نہیں کیا اس سے قطع نظر کہ اس کا قائل کون ہے۔

اور دوسری طرف ایک آدمی کسی مسئلہ میں قول ضعیف یا مرجوح رکھتا ہے جس کو عموماً قبول نہیں کیا جاتا لیکن جب وہ اہل علم و اجتہاد میں سے ہے تو اس کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہیں کی جاتی۔

کیوں نہ ہو کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"إذا كان الماء قلتين لم يحمل الخبث" (مسند احمد: ۴۹۶۱، ابوداؤد: ۶۳، واللفظ لہ، نسائی: ۳۲۸، ترمذی: ۶۷، ابن ماجہ: ۵۱۷، تفصیلی تخریج کے لئے ملاحظہ ہو: شرح بلوغ المرام ۱/۱۲۰-۱۳۱)۔

(پانی جب دو قلہ کی مقدار میں ہو تو گندگی کا اثر قبول نہیں کرتا)۔

اس ارشاد کے ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ جس آدمی کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑا صاحب فضائل اور خوبیوں کا مالک، نیز وسیع العلم ہوتا ہے اس کی طرف سے سامنے آنے والی

مرجوح وضعیف آراء کو بھی اس طرح گوارا کیا جاتا ہے کہ دوسرے کی طرف سے نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ وہ جب اس قسم کی بات کہتا ہے تو اپنے اجتہاد کی بنیاد پر کہتا ہے جس کے پیچھے وہ اپنی پوری سعی وتوانائی لگادیتا ہے، اور دوسرے کے اجتہاد کو اپنے لئے قابل عمل نہیں بناتا۔

اور اس کے مقابلے میں وہ آدمی کہ جس کا علم ناقص و پراگندہ ہو، فہم کمزور وسقیم ہو، اور خواہشات نفس کا شکار ہو، ایسا آدمی اگر کوئی کمزور بات اپنی زبان سے نکالے تو اس کا معاملہ یہ نہیں ہوتا (نہ اس کی سنی جاتی ہے اور نہ مانی جاتی ہے)۔

اسی طرح ایک مثال صدقہ فطر کی بابت اختلاف کی ہے، کہ حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ ہم لوگ حضور ﷺ کی حیات میں صدقہ فطر، ہر چھوٹے بڑے، آزاد وغلام کی طرف سے ایک صاع کھانے کی چیز، یا ایک صاع پنیر، یا ایک صاع جو، یا ایک صاع کھجور یا کشمش نکالا کرتے تھے اور یہی ہم نکالتے رہے حتی کہ (ایک مرتبہ) ہمارے پاس (مدینہ میں) حضرت معاویہؓ تشریف لائے جو حج یا عمرہ کی غرض سے (شام سے) آئے تھے، تو انہوں نے منبر پر لوگوں سے خطاب کیا اور خطاب میں یہ بھی فرمایا کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ شام کا گیہوں دو مد، ایک صاع کھجور کے برابر ہے (اور وہی حیثیت رکھتا ہے) تو لوگوں نے دو مد گیہوں (یعنی نصف صاع) پر عمل شروع کر دیا لیکن میں تو جو کرتا رہا اور دیتا رہا جب تک زندہ ہوں ہمیشہ یہی کروں گا (بخاری:۱۵۰۸، مسلم:۹۸۵)۔

اس مسئلہ میں حضرت معاویہؓ کے مذہب کو بعض صحابہ وتابعین نے اختیار کیا ہے اور بعض ائمہ متبوعین نے بھی اس پر ان کی موافقت کی ہے۔

یہ اختلاف بھی ایسا ہے کہ آپ یہ دیکھیں گے کہ حضرت معاویہؓ نے اس مسئلہ میں اجتہاد کیا، اور ان سے پہلے حضرت عمرؓ کا اجتہاد بھی یہی تھا (ملاحظہ ہو: سنن ابی داؤد: ۱۶۱۴، بدائع الصنائع ۲/ ۲۰۳)، اور بقیہ خلفاء اربعہ سے بھی یہی منقول ہے اور مرفوعا بھی اس روایت کی گئی

ہے (ملاحظہ ہو: مسند احمد: ۳۲۹۱، سنن ابی داؤد: ۱۶۲۲، جامع ترمذی: ۲۷۴)۔ اسی لئے بہت سے ائمہ متبوعین نے اس رائے میں ان کی متابعت وموافقت کی ہے۔

صحابہ کے اختلافی مسائل میں ایک حضرت معاویہؓ کا اجتہادی قول مسلمان کے کافر سے وارث ہونے کے بارے میں ہے، صحیح روایات میں حضرت اسامہ بن زیدؓ سے ارشاد نبوی منقول ہے:

"لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم" (بخاری: ۶۷۶۴، واللفظ لہ، مسلم: ۱۶۱۴)۔

(مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوگا اور نہ کافر مسلمان کا)۔

حضرت معاویہؓ کی رائے یہ تھی کہ مسلمان کافر کا وارث ہوسکتا ہے، کیونکہ اسلام زیادہ ہوتا ہے کم نہیں ہوتا (ملاحظہ ہو: سنن سعید بن منصور: ۱۴۵، ۱۴۶، شرح النووی علی مسلم ۱۱/۵۲، عون المعبود ۸/۸۴، ۸۵)۔

اوران کا منشا یہ تھا کہ اگر ہم کافر کو اسلام کی صورت میں میراث سے محروم قرار دیں گے تو ہوسکتا ہے کہ ایک کافر اسلام ہی نہ لائے یا یہ کہ اس میں تاخیر کرے تا کہ اپنے باپ یا گھر والوں کی میراث حاصل کر سکے، تو انہوں نے قبول اسلام کی روح کی حفاظت کے لئے اور اس میں آدمی کے داخلہ کا نظام جاری رہے، یہ بہتر سمجھا کہ مسلمان کو اس کے کافر باپ کا وارث قرار دیا جائے تا کہ وہ اسلام میں داخل ہو سکے اور میراث اس کے لئے اسلام سے مانع نہ بنے، بعض تابعین نے ان کے اس قول کو اختیار کیا ہے (ملاحظہ ہو: الام للشافعی ۱/۴۳۵، التمہید لابن عبد البر ۹/۱۶۳، الاستذکار ۵/۳۶۸، فتح الباری ۱۲/۵۰)۔

ایسے ہی حضرت معاویہؓ کی رائے سونے وچاندی کے زیورات کے بارے میں ہے کہ وہ زیورات کو سونے وچاندی کے ڈھیلوں کے بدلے کمی وزیادتی کے ساتھ بیچنے کو جائز سمجھتے تھے (ملاحظہ ہو: مصنف عبدالرزاق: ۱۴۱۹۳، مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۲۴۹۳، مسند احمد: ۲۲۷۷۶، مسلم: ۱۵۸۷، سنن بیہقی کبری ۵/۲۷۷، الاستذکار ۶/۳۴۷، ۳۴۸، تفسیر القرطبی ۳/۳۴۹)۔

ابن تیمیہؒ نے بھی یہ رائے اختیار کی ہے اور کتاب ''تفسیر آیات أشکلت'' میں اس کی تائید وتقویت کی ہے (ملاحظہ ہو: مجموع الفتاویٰ ۴/ ۳۰۷، ۴، تفسیر آیات اشکلت ۲/ ۶۲۲-۶۳۲)۔ ان کے بعد ابن القیمؒ نے ''اعلام الموقعین'' میں یہی موقف اختیار کیا ہے (ملاحظہ ہو: اعلام الموقعین ۲/ ۱۵۹-۱۶۴)۔

تو صحابہؓ کے درمیان بہت سے مسائل میں اختلاف ہوا اور رہا جن کو شمار نہیں کیا جا سکتا، حتی کہ اعتقادیات سے متعلق بعض امور میں بھی ان کے درمیان اختلاف ہوا، اگرچہ وہ امور فروعی قسم کے ہیں، (اصولی نہیں ہیں) جیسے نبی اکرم ﷺ کا حق تعالی کی زیارت سے مشرف ہونے کا مسئلہ اور اس میں ان کا اختلاف۔

جمہور صحابہ کی رائے تو یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے سر کی آنکھوں سے حق تعالی کو نہیں دیکھا، اور بعض کی رائے ہے- اور یہ ابن عباسؓ سے منقول ہے- کہ رسول اللہ ﷺ نے حق تعالی کو دیکھا (ملاحظہ ہو: شرح اصول اہل السنہ: ۹۰۴، ۹۰۵، شرح العقیدۃ الطحاویہ/ ۲۱۳، فتح الباری ۷/ ۲۱۸، ۸/ ۶۰۷، مجموع الفتاوی ۶/ ۵۰۷، زاد المعاد ۳/ ۳۰)۔

بہر حال یہ گفتگو و بحث تو کافی لمبی ہے، لیکن خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کے درمیان اختلاف ہوا اور ان کے بعد تک رہا، چنانچہ بعد میں کوئی اس کا قائل رہا اور کوئی اس کا (ملاحظہ ہو: شرح العقیدۃ الطحاویہ/ ۲۱۳، تفسیر القرطبی ۱۷/ ۹۲، مجموع الفتاوی ۳/ ۳۸۶)۔

ان کے اختلافی مسائل میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ مومن کو قبر میں اہل خانہ کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے، حالانکہ یہ غیبی مسائل اور اخروی امور میں سے ہے، اور یہ بھی فروعی مسائل کے قبیل سے ہی ہے، حضرت عائشہؓ کو جب حضرت عمرؓ کی یہ روایت پہنچی:

''إن الميت يعذب ببعض بكاء أهله عليه'' (بخاری: ۱۲۸۸، مسلم: ۹۲۷)۔

(میت کو اس کے گھر والوں کے بعض رونے سے عذاب ہوتا ہے)۔

تو حضرت عائشہؓ نے اس کا انکار کیا اور فرمایا کہ اللہ عمر پر رحم کرے، بخدا رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا:

"إن المؤمن ليعذب ببكاء أهله عليه"، بلکہ آپ ﷺ نے تو یہ فرمایا ہے:

"إن الله ليزيد الكافر عذاباً ببكاء أهله عليه"۔

(اللہ تعالیٰ کافر کو گھر والوں کے رونے کی وجہ سے مزید عذاب دیتے ہیں)۔

اور حضرت عائشہؓ نے فرمایا: تمہارے لئے قرآن کافی ہے، "ولا تزر وازرة وزر أخرى" (بخاری:۱۲۸۸، واللفظ لہ، مسلم:۹۲۹) (اور ایک کا بوجھ دوسرا نہ اٹھائے گا)۔

اسی طرح حضرت عائشہ کے سامنے جب یہ بات نقل کی گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے مقتول کفار کو ایک کنویں میں ڈلوانے کے بعد ان سے خطاب فرمایا اور فرمایا:

"يا فلان بن فلان و يا فلان بن فلان! هل وجدتم ما وعدكم الله ورسوله حقاً؟ فإني قد وجدت ما وعدني الله حقاً" (مسلم:۲۸۷۳ عن انسؓ)۔

(اے فلاں بن فلاں، واے فلاں بن فلاں، کیا تم نے اللہ اور رسول کے تم سے کئے ہوئے وعدوں کو حق پایا؟ میں نے تو اللہ نے جو مجھ سے وعدہ فرمایا تھا اس کو حق۔ واقع وثابت پالیا)۔

حضرت عائشہؓ نے اس کو سن کر انکار ہی کیا اور فرمایا: آپ نے تو یہ فرمایا ہے کہ وہ اب یہ جان ومان رہے ہیں کہ میں ان سے جو کہتا تھا وہ حق تھا، پھر یہ آیات پڑھیں (بخاری:۳۹۷۹، واللفظ لہ، مسلم:۹۳۲):

"إنک لا تسمع الموتی" (النمل:۸۰) (آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے)۔

اور: "ما أنت بمسمع من في القبور" (فاطر:۲۲) (آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں)۔

اس قسم کے فروعی مسائل میں ان کا اختلاف ہوا اور انہوں نے اس اختلاف کو قبول بھی

کیا، اور ان سے ایسی کوئی بات ثابت نہیں کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ اختلاف رائے وتعدد رائے سے الجھتے تھے بشرطیکہ یہ اختلاف نص شرعی کے حدود میں ہو، اور ضلال و بدعت تک نہ پہنچا ہوا ہو اور نہ ہی صریح کتاب وسنت سے معارض ومتصادم ہو، اور نہ یہ آنا ہے کہ ان میں سے کسی نے اختلاف کی وجہ سے دوسرے پر حملہ کیا ہو یا سخت کلامی کی ہو، جیسے کہ یہ منقول نہیں کہ ان میں سے کسی نے کسی بات کو محض اس وجہ سے قبول کرلیا ہو کہ فلاں نے یہ کہا ہے۔

اور اس طرح ان حضرات نے توازن کو برقرار رکھا، ایک طرف تو انہوں نے قول مرجوح یا ضعیف کو (آنکھ بند کرکے) قبول نہیں کیا اگرچہ اس کا کہنے والا امیر المؤمنین کیوں نہ ہو اور دوسری طرف کہنے والے کے مقام ومرتبہ کو طعن وتشنیع اور بے جا حملے نیز بے توقیری وتحقیر سے بھی محفوظ رکھا۔

بلاشبہ یہ تکوینی امر - یعنی باہمی اختلاف، جس کے انسانوں کے درمیان وقوع کی اللہ تعالی نے خبردی، یہ اس امت میں بھی ہوا اور ہوگا، اور یہ محال ہے کہ تمام انسان سارے اختلافی مسائل میں یا اکثر ایسے مسائل میں ایک ہی رائے پر متفق ومجتمع ہوں، میں یہ بات تاکیدی طور پر اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں نے اس زمانہ کے ایک صاحب علم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ امت کو ایک ہی قول پر متفق کرنا ممکن ہے، خواہ فروعی مسائل میں کیوں نہ ہو۔

اور شاید ان کا خیال یہ ہے کہ ہم جب احادیث نبویہ کی تصحیح وتنقیح نیز ان میں انتخاب واختیار کا کام کرسکتے ہیں تو بلاشبہ ہم امت کو ان پر جمع جو متفق کرنے کا بھی کام کرسکتے ہیں۔

لیکن یہ بات ایک عجوبہ ہے، اور اس کا کسی ذی مرتبہ وبارتبہ عالم کی زبان پر آنا شدت سے اس کا تقاضا کرتا ہے کہ جس بات کا میں نے ذکر کیا ہے اس کا تذکرہ خوب کیا جائے کہ اختلاف واقع ہوکر رہنے والی چیز ہے (اس سے بچا نہیں جاسکتا)، واقعہ یہ ہے کہ بعض مرتبہ بڑوں سے بھی عجیب وغریب باتیں سننے کو ملتی اور صادر ہوتی ہیں تو چھوٹوں وکم مرتبہ لوگوں کا کیا سوال وشمار؟

علماء نہ تو احادیث کی تصحیح پر متفق ہوئے، اور نہ صحت حدیث کی شرطوں پر، اور نہ ہی رواۃ کی توثیق پر، اور نہ اس پر کہ طرق حدیث آپس میں ایک دوسرے کی تقویت کرتے ہیں، ان کے درمیان بڑا اختلاف ہے، احادیث کے اندر علت کے بیان میں مرسل و متصل، اور مرفوع وموقوف کے درمیان ترجیح میں، نیز فن حدیث کے بہت سے مسائل میں دوسرے فنون کو جانے دیجئے، اس لئے امت کو ایک مذہب پر جمع کرنے کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے، بلکہ اختلاف ضروری ہے جو قیامت تک واقع و برقرار رہے گا۔

فصل دوم

آداب اختلاف

۱- ادب اختلاف کی اہمیت

۲- اختلافات سے متعلق باہمی مذاکرہ ایک بہترین حل

۳- اختلاف کا ایجابی نفع

۴- اختلاف کے اخلاقیات

۵- اختلاف کو برتنے ونباہنے کے قواعد وآداب

۶- حدیث افتراق کی ایجابی توجیہ ومفہوم

(۱)

ادب اختلاف کی اہمیت

عموماً ہم سب کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ اختلاف کے اخلاقیات سے متعلق گفتگو کرتے ہیں اور بڑے اچھے انداز وسکون کے ساتھ یہ گفتگو کرتے ہیں اور اس میں ہم کوشش کرتے ہیں کہ لفظ وزبان کی حد تک ہم اچھے ومناسب نظریات پیش کریں۔

لیکن ہم میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں کہ جو ان نظریات کو (جن کا تذکرہ باہمی گفتگو میں بڑی اہمیت کے ساتھ آتا ان کو) موقع پر برت سکیں اور اپنے علمی معاملات میں ان کا استعمال وتطبیق کریں، اور اسی طرح یہ کہ اختلاف کرنے والوں کے ساتھ اختلافی گفتگو وماحول میں ان کے مطابق معاملہ کریں۔

گویا کہ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم دوسروں سے تو یہ چاہتے ہیں کہ وہ اگر ہم سے اختلاف کریں تو اختلاف کے اخلاقیات کو برتیں اور ان کا التزام واہتمام کریں لیکن خود اپنی ذات کے حق میں دوسروں سے اختلاف کرنے ورکھنے کے موقع میں ہم اس کے لئے تیار نہیں۔

اس لئے ہم کو اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے مدارس اور تعلیمی اداروں میں نیز مساجد میں اختلاف کے آداب واخلاقیات کے درس وتدریس کا اہتمام ونظم کریں، اور اپنے نوجوان لڑکوں ولڑکیوں کو اس کی عملی تربیت ومشق پر محنت کرائیں تاکہ یہ چیز ایک ہی وقت میں ہماری عادت بھی ہو اور عبادت بھی ہو۔

یہ چیز عبادت تو یوں ہوگی کہ اس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طاعت ہے اور

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی سنتوں کی اتباع ہے۔

اور عادت ہونے کی بات یہ ہے کہ جب آدمی کی تربیت ہی اس پر ہوگی اور اس کو اس کی عملی مشق کرائی جائے گی تو یہ آدمی کی فطرت وطبیعت ہو جائے گی جس پر عمل کرنے اور جس کو برتنے میں آدمی کو تکلف وزحمت نہیں ہوتی۔

باہمی گفتگو (کسی بھی موضوع پر ہو اور بالخصوص اختلافی موضوع پر اس) کے آداب بہت اہم ہیں، اس کی ضرورت حاکم کو بھی ہوتی ہے تاکہ رعیت ورعایا کے حقوق کی وہ حفاظت کر سکے حتی کہ ان لوگوں کے حقوق کی بھی جو اس سے اختلاف کرتے ور کھتے ہیں جیسے نبی اکرم ﷺ نے سب کے حقوق کی حفاظت فرمائی، حتی کہ مدینہ میں جو آپ کے مخالفین۔ یہود ومنافقین۔ تھے ان کے حقوق کی بھی حفاظت فرمائی۔

رہا آپ کا معاملہ آپ کے اصحاب وصحابہ کے حق میں، تو اس بابت تو آپ کی ذات کی حد تک آپ کے صبر وعفو، درگزر وانصاف اور طالب حق تک اس کے حق کی ادائیگی ورسائی کو پوچھو ہی مت کہ آپ کا کیا اسوہ وعمل رہا۔

اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی آپ کے اس معمول ودستور کا پورا لحاظ وپاس رکھا، دیکھئے حضرت علیؓ کو کہ جب خوارج کی طرف سے ان کے خلاف خروج وبغاوت کا معاملہ سامنے آیا اور ان کی طرف سے اسلام کی تاریخ میں پہلی مرتبہ انتہائی خطرناک رخ سامنے آیا کہ جس میں انہوں نے خود مسلمانوں سے دوری، ٹکراؤ اور سخت اختلاف کو اپنایا اور نوبت جنگی اقدامات تک آگئی جس سے خلافت اسلامیہ کو نقصان پہنچا، ایسے لوگ اور اس قسم کے حالات تھے پھر بھی حضرت علیؓ نے ان کے حق میں فرمایا:

"إخواننا بغوا علينا" (ابن ابی شیبہ: ۳۷۷۶۳، بیہقی سنن کبری ۸/ ۱۷۳)۔

(وہ ہمارے بھائی ہی ہیں جو ہمارے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں)۔

انہوں نے اس صورت حال میں ان کو کفر وغیرہ کے ساتھ متصف وموسوم نہیں کیا، اور اسی پر بس نہیں بلکہ حضرت علیؓ نے ان کے حقوق کی حفاظت فرمائی اور فرماتے رہے جب تک انہوں نے یہ روش نہیں اپنائی کہ ہتھیار اٹھائیں واستعمال کریں، اور راستوں کو پرخوف وپرخطر بنائیں اور ناحق خون کو حلال سمجھیں۔

ان آداب اختلاف کا ایک عالم بھی ضرورتمند ہوتا ہے تاکہ طلباء کے حقوق کی حفاظت کرے، ان کے ساتھ اور ان کے حق میں انصاف کرے، اور ان کے سوالات واشکالات واعتراضات وغیرہ کی بابت ان کے حق میں حسن ظن سے کام لے، ان کے لئے اپنے سینہ کو کشادہ رکھے، اور ان کی تربیت پوری ذمہ داری سے اس طرح کرے کہ اپنی شخصیت کے زعم میں ڈوب کر ضائع نہ ہوجائے، تاکہ وہ ہم کو ایسے افراد فراہم کرے جو شریف النفس، کریم الخلق اور لائق سیادت ہوں، اور وہ کمزور قسم کے مقلدین صرف پیچھے چلنے وپھرنے والے نہ ہوں۔

ان آداب اختلاف کی ایک باپ کو بھی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ اولاد کے لئے وہ محبوب ہو، اور اگر وہ کسی مسئلہ میں اس سے اختلاف کریں تو اس کی طرف سے ان کے حق میں عذر کا اعتبار ہو اور وہ اس کو محسوس کرے کہ یہ بچے آج ہمارے چھوٹے ہیں تو کل دوسروں کے بڑے ہوں گے، اس لئے کہ یہ مطلوب نہیں کہ لڑکا یا لڑکی والدین کا مکمل عکس ہو بلکہ جیسے اولاد میں سے ہر ایک اپنا خاص جسمانی وجود ونظام - ایک ایک عضو و پور، آواز، آنکھ کا حلقہ - وغیرہ رکھتا ہے ایسے ہی ہر بچہ اپنا ایک خاص فکری وعقلی معیار اور امتیاز بھی رکھتا ہو۔

چونکہ آئندہ ہم اختلاف کے آداب سے متعلق گفتگو کریں گے اس لئے ہم کو اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہمارے باہمی اختلاف کو برتنے کے اصول وضوابط اور اس کا نظام ومزاج کیا ہو، اس کو بتایا جائے، چنانچہ پہلے اس کو ذکر کیا جاتا ہے۔

(۲)

باہمی گفتگو و مذاکرہ

باہمی اختلاف اور متعلقات کے حل کا ایک بہترین ذریعہ

ہمارا یہ زمانہ ایسی کشادگی اور کھلے پن کا زمانہ ہے کہ جس میں تمام حدود ٹوٹ چکی ہیں اور ہر قسم کی رکاوٹیں تہس نہس ہوگئی ہیں کہ آج ہم ہوائی و فضائی یعنی ٹی وی و انٹرنیٹ کے عہد میں ہیں اور آج حکومتیں یہ محسوس کر رہی ہیں۔ غیروں کا معاملہ در کنار۔ کہ روک ٹوک اور ہنگامہ آرائی کا اب کوئی نفع نہیں ہے، اب تو واحد و تنہا حل یہ ہے کہ میدان میں اترا جائے، دلیل کا دلیل سے اور لوہے کا لوہے سے جواب دیا جائے۔

عوام کا حال یہ ہے کہ ان کی مجالس مختلف و متعارض آراء و خیالات کی آماجگاہ بن چکی ہیں، اس سے قطع نظر کہ سب باتوں کو سب لوگ مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں اور یہ کہ سب باتیں ان کی سمجھ میں آتی ہوں یا نہ آتی ہوں اور اب صورت یہ ہے کہ جن لوگوں کی آراء واقعی بہت کمزور اور ان کی دلیلیں بڑی بودی ہوتی ہیں ان کو بے وقوف، کم عقل و نا سمجھ کہہ کر کام چلنے والا نہیں ہے بلکہ یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ایسے لوگوں کی اس قسم کی باتیں بھی توجہ سے سنی جائیں اور پھر ان کے فکر و خیال کے مطابق اس کا جواب دیا جائے، کیونکہ دوا و بیماری دونوں میں تناسب ضروری ہے، اس لئے کہ اسی صورت میں جسم علاج کو قبول کرتا ہے اور اس کو اس سے نفع ہوتا ہے۔

خلافیات کی بابت باہم گفتگو پر کام کرنے والے بہت سے اداروں کی انٹرنیٹ پر یہ رپورٹ سامنے آئی ہے کہ اس گفتگو کو فعال و مؤثر بنا کر پیش کرنے میں بڑا خلل و نقص پایا جاتا ہے،

اور یہ کہ ایسا کام کرنے والے بہت سے لوگ خود مسلمانوں کے درمیان جو متفق علیہ نقاط ونکات ہیں انہیں سے وہ ناواقف ہیں اور ایسا ہر حلقے میں ہے، اہل علم، اہل دعوت، اہل سنت، سب اپنے اپنے دائرہ کار میں متفق علیہ امور ونقاط سے ناواقف ہیں، اسی طرح مصلحت کیا ہے؟ اور کب کہاں کیا ہوتی ہے اور کس طرح اس سے کام لیا جاتا ہے یا لیا جاسکتا ہے؟ اس سے بھی ناواقف ہیں۔

اور اختلافی امور نیز ان کے دفعیہ وحل کی بابت گفتگو میں متفق علیہ نکات سے ناواقفیت اور اس کی بابت تساہلی پر بڑے سلبی آثار مرتب ہوتے ہیں، چنانچہ آج کل کی الکٹرانی ومیڈیائی (نٹ وغیرہ کے واسطے سے ہونے والی) گفتگو میں شریعت کے اخلاقی نظام کے برخلاف، جو سخت حملے اور جارحانہ گفتگو وانداز ہم دیکھ، سن اور پڑھ رہے ہیں، یہ اسی سب کا ایک اثر ہے، اسی قبیل کی چند چیزیں ملاحظہ ہوں۔

۱- اگر تم میرے ساتھ نہیں تو تم میرے مخالف ہو:

آج کا یہ ایک مزاج ہے کہ ’’اگر تم میرے ساتھ نہیں تو تم میرے مخالف ہو‘‘، مطلب یہ ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان کسی بھی قسم کا اختلاف یا فرق ہے، چاہے وہ جزئی اور معمولی مسائل میں کیوں نہ ہو تو محض اس بنیاد پر ہم شدید دشمنوں میں بدل جاتے ہیں بجائے اس کے کہ ہم باوفا دوست ہوں۔

۲- موضوع وشخصیت کے درمیان خلط مبحث:

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی موضوع، نظریہ یا مسئلہ پر گفتگو کے بجائے بات شخصیات پر حملے تک پہنچ جاتی ہے اور نوبت طعن وتشنیع، اتہام، بدنیتی کے الزام تک آجاتی ہے اور اس کی کہ فلاں کی تاریخ اور ماضی کے حالات کیا رہے ہیں اور فلاں نے کیا، اور پھر بہت سی وسعت وفراخی والی چیزیں رسوائی واتہامات کا محل وموقع بن جاتی ہیں، اسی طرح ایسے الزامات کا بھی جن کی کوئی

حقیقت نہیں ہوتی، اور اس کے بعد شخصیت پسندی پر مبنی اور گروہی صف بندی کی نوبت آتی ہے جس میں ایک دوسرے کے خلاف صرف جذباتی باتیں ہی سامنے آتی ہیں اور اس میں عقل ودلیل اور مصلحت کا کوئی عمل ودخل نہیں رہ جاتا اور نہ ایسی کسی چیز کی سنوائی ولحاظ ہوتا ہے۔

۳- باہمی گفتگو کی زبان کا گنداپن:

اور یہ بھی ہوتا ہے کہ افہام وتفہیم کا وہ طریقہ جس کو "جادلهم بالتي هي أحسن" (ان سے اچھے انداز میں بحث کرو) سے تعبیر کیا گیا ہے وہ ایک قسم کے سب وشتم سے بدل جاتا ہے، اور پھر جیسا کہ ائمہ حق - امام غزالیؒ، شیخ ابن تیمیہؒ اور شاطبی وغیرہ- نے فرمایا ہے یہ حال ہوجاتا ہے کہ اگر افہام وتفہیم میں غلبہ چیخ وپکار کی بنیاد پر ہوتا تو جاہل دوسروں سے زیادہ غالب رہتے، جبکہ غلبہ وکامیابی کو ضرورت دلیل اور سکون وتحمل کی ہوتی ہے، اور مثل معروف ہے کہ خالی ڈبہ بھرے ہوئے ڈبے سے زیادہ آواز وشور کرتا ہے۔

۴- الفاظ کا زور:

اپنے مخالفین کو زیر کرنے کے لئے اپنی خیالی وتوہماتی باتوں کو، نیز اپنے زعم وخیال کے مطابق معاشرہ کی ترقی واصلاح کی فکروں کو ہم الفاظ کے زور کی بنیاد پر پیش کرتے اور سجاتے ہیں۔

چنانچہ ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی تم سے کہے کہ فلاں نے بڑا اچھا مضمون لکھا ہے، اور تم یہ سوچو گے کہ یہ مضمون مضبوط اور پختگی وگہرائی کا حامل ہوگا جس میں صاحب مضمون نے بھرپور کوشش کی ہوگی اور پوری تنقیح وتحقیق کا ثبوت پیش کیا ہوگا یا یہ کہ موضوع کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرلیا ہوگا۔ لیکن وہ مضمون سامنے آنے پر معلوم ہوگا کہ وہ زور آور الفاظ وعبارات سے بھرا ہوا ہے جس میں مخالفین کی بھرپور خبر لی گئی ہے، اور ان کی تحقیر وتنقیص کی گئی ہے۔

ہماری تحریروں، تقریروں، بلکہ نشریاتی پروگراموں میں اسی قسم کی قوت کا مظاہرہ کیا جاتا

ہے کیونکہ اکثر لوگوں کے نزدیک قوت وطاقت اسی کا نام ہے، چیخا چلایا جائے، بات کو آخری حد تک پہنچا دیا جائے، اور سخت و تکلیف دہ الفاظ کو جمع کیا جائے اور مخالفین پر ان کی بارش کی جائے۔

۵-انفرادیت وتفرد:

یہاں میرا مقصود حق تعالی کے اس ارشاد سے ہے:
"ما أريكم إلا ما أرى وما أهديكم إلا سبيل الرشاد" (غافر:۲۹) (میں تو تم کو وہی رائے دوں گا جو خود سمجھ رہا ہوں اور میں تم کو عین طریق مصلحت بتا تا ہوں)۔
ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی بس اپنی شخصیت، اپنی رائے، اپنا نظریہ، اسی میں لگا رہتا ہے اور اسی کو لے کر چلتا ہے جبکہ یہ سب کچھ منزل من اللہ کوئی چیز نہیں ہوتی، نہ قرآن کی آیت اور نہ حدیث نبوی اور نہ ہی اجماع، بس ایک شخصی رائے ہوتی ہے جو زیادہ سے زیادہ صائب ودرست ہونے کا پہلو رکھتی ہے (حق ہونے کا نہیں کہ جس کا بالمقابل باطل ہو) لیکن یہ آدمی اور کچھ دوسرے (جو اس کے معتقد ہوتے ہیں) سب، اسی کے اردگرد رہتے ہیں، اور ان کے نزدیک مدار حکم وشرع اسی بات پر ہوتا ہے۔

۶-قطعیت:

اس کا مطلب یہ سوچ ہے: درست وصواب تو میری ہی بات ہے، اس میں خطا کا کوئی احتمال نہیں، اور دوسرے کی بات اور دوسری بات خطا ہی خطا ہے، اس میں درستگی وصحت کا کوئی حصہ نہیں ہے۔
لیکن اے کاش کہ قطعیت کا معاملہ شریعت کے نازل کردہ محکم احکام کے ساتھ ہوتا یا ان امور کے ساتھ جو افراد امت یا عام امت کی مصالح کے مدنظر اجماع سے ثابت ہیں، اس صورت میں قطعیت کی بات خیر ونیکی کی ہی ہوتی، لیکن ہم جب اختلافات میں الجھتے ہیں اور

نزاع و بحث میں پھنستے ہیں تو واقعی محکم احکام کو بھلا دیتے ہیں، یا بھول جاتے ہیں اور ہمارے لئے وہ مسائل قطعی بن جاتے ہیں جو الحاقی، قیاسی اور جزئی ہوتے ہیں یا ذوقیات وغیرہ پر مبنی ہوتے ہیں۔

۷۔ سطحیت و سرسری پن:

بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کا سمجھنا ہمارے لئے دشوار ہوتا ہے یا وہ خاص غور وفکر، تدبر و تامل کی محتاج معلوم ہوتی ہیں، اسی طرح جو باتیں حق وسنت کے خلاف ہوتی ہیں، جو لوگ ایسی باتیں کیا کرتے ہیں وہ شر پسند و فتنہ جو ہوتے ہیں اور وہ باتوں کے تاجر و فلسفی ہوتے ہیں یا بال کی کھال نکالنے والے جن کا مقصد علم و معرفت کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے، اور اس قسم کی باتیں کر کے ہم لوگ اپنی معمولی عقلی صلاحیتوں کی بنیاد پر خود کو دوسروں کے حق میں حکم و فیصل قرار دیتے ہیں اور عمرو بن معدی کرب کے اس قول کو بھول جاتے ہیں:

إذا لم تستطع شيئا فدعه وجاوزه إلى ما تستطيع

(جو کام تمہارے بس کا نہ ہو اس کو چھوڑ کر دوسرا کام کرو جو تمہاری سکت و وسعت میں ہو)۔

اسی قبیل کی چیزوں میں بعض ٹی وی چینلوں پر آنے والے مذاکرات ہیں جس میں زیادہ تر شور وشغب ہوتا ہے اور جھگڑے کے ساتھ اس قسم کی بدزبانیاں سامنے آتی ہیں:

"بخدا فلاں کا اللہ تعالی کے یہاں اور کسی مومن کے نزدیک کوئی مقام و اکرام نہیں، اور فلاں کا اللہ کے یہاں کوئی نصیبہ نہیں"۔

ذرا جرأت تو دیکھو کہ حق تعالی اور اس کے نیک بندوں کے بالمقابل آدمی کیا کہتا ہے، جب کسی شخص کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے ہم کو اس سے محبت نہیں ہوتی یا اس کا احترام نہیں ہوتا اور مانا جاسکتا ہے کہ وہ غلطی پر ہے یا حق سے کچھ منحرف ہے تو اس کے حق میں ہمارا ذوق اور

ہمارے سلبی احساسات یہ ہو جاتے ہیں کہ ہم اس معاملہ کو اس کے حق میں یہ حکم لگانے کا ضابطہ بنا لیتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے، اور نہ اس کے موحد بندوں کے نزدیک ہے، حالانکہ وہ اپنے حالات کے مطابق مسلمان، اور صاحب ایمان ہی ہوتا اور رہتا ہے۔

اسی طرح یہ بھی ہے کہ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں: فلاں مر گیا، جہنم میں گیا، برا انجام ہوا۔

اور بعض مرتبہ تو اس قسم کی بات کسی ایسے شخص کے حق میں کہی جاتی ہے جو مسلمانوں کا بڑا مقتدا و امام، بڑا صاحب علم و فضل، بڑے درجہ کا مخلص داعی، یا مومن کامل ہوتا ہے، جیسا کہ ہم محسوس کرتے ہیں، باقی اصل معاملہ تو اس کا اپنے اللہ سے ہوتا ہے، لیکن ناسمجھ لوگ جرأت سے کام لیتے ہیں اور اس قسم کی باتیں کرتے ہیں اور کسی طرح کی کوئی احتیاط نہیں کرتے۔

یا مثلاً اس طرح کی بات کہتے ہیں کہ فلاں کا عقیدہ صحیح نہیں ہے یا یہ کہ اپنی ذات کی بابت حسن ظن کی وجہ سے فتنہ کا شکار ہے، حالانکہ وہ فلاں بسا اوقات اس سے اچھے عقیدہ والا ہوتا ہے اور اچھا مذہب رکھتا ہے نیز کتاب و سنت سے تعلق بھی اس کا زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔

یا یوں بھی کہہ دیتے ہیں کہ فلاں کافر ہے، فلاں تو منافق ہے، اور آدمی اس قسم کی باتیں یوں کہتا ہے جیسے کہ یہ بات اس نے حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے سنی ہو یا حضرت جبریل امین علیہ السلام سے حاصل کی ہو۔

اصل میں اس قسم کی باتیں آدمی خود اپنے آپ کی بڑائی اور تعریف کے لئے کرتا ہے، خواہ وہ اس کو محسوس کرے یہ نہ کرے، یہ باتیں کہہ کر خود کو نجات یافتہ لوگوں میں اور مخلص اہل یمان میں بتاتا ہے اور یہ ثابت و ظاہر کرتا ہے کہ اللہ کے دین کے حق میں وہ بڑا غیور اور اس کے ندوں کا بڑا خیر خواہ ہے، (اور یہ نہیں جانتا کہ یہ سب دراصل کبر کا شاخسانہ و نتیجہ ہوتا ہے جس کو یہ سوس نہیں کرتا) اور نبی اکرم ﷺ نے (کبر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے) فرمایا ہے:

"هو بطر الحق وغمط الناس" (مسلم:۹۱ عن ابن مسعودؓ) (کبر تو حق کا انکار اور انسانوں کی تحقیر وتذلیل ہے)۔

اگر مذاکراتی گفتگو میں۔خواہ کسی موضوع پر ہو۔ ہر فریق اپنے کو قطعی طور پر صحیح وحق پر سمجھے اور فریق مقابل کو قطعی طور پر غلط و باطل پر سمجھے تو ایسی گفتگو کے انجام کی کیا توقع کی جائے گی۔ جبکہ مسئلہ زیر گفتگو وزیر بحث ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ پورے طور پر نظری اور محل تردد ہو، اس میں اللہ یا اس کے رسول ﷺ کی کوئی نص وفرمان نہ ہو۔

اور پھر مان لیا جائے کہ تمہاری بات قطعی طور پر حق اور دوسرے کی بات قطعی طور پر غلط ہو تو حکمت کا تقاضا تو یہی ہے کہ دعوت کی بات اور مذاکراتی گفتگو متفق علیہ دائرہ ونقطہ سے شروع کی جائے جیسا کہ حق عزوجل نے ہم کو تعلیم فرمایا ہے، ارشاد ہے:

"قل يا أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم ألا نعبد إلا الله ولا نشرک به شيئاً ولا يتخذ بعضنا بعضا أرباباً من دون الله فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون" (آل عمران:۶۴)۔

(آپ فرمادیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان (مسلّم ہونے میں) برابر ہے کہ بجز اللہ تعالی کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب نہ قرار دے، خدا تعالی کو چھوڑ کر پھر اگر وہ لوگ اعراض کریں تو تم لوگ کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم تو ماننے والے ہیں)۔

بلکہ حق تعالی نے تو ہم کو اس سے بھی بڑھ کر ہدایت دی ہے، چنانچہ فرمایا ہے:

"قل من يرزقكم من السموات والأرض قل الله وإنا أو إياكم لعلى هدى أو في ضلال مبين قل لا تسئلون عما أجرمنا ولا نسئل عما تعملون" (سبا:۲۴،۲۵)۔

(آپ پوچھئے کہ (اچھا بتلاؤ) تم کو آسمان اور زمین سے کون روزی دیتا ہے آپ (ہی) کہہ دیجئے کہ اللہ دیتا ہے اور (یہ بھی کہئے) کہ ہم یا تم ضرور راہ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں ہیں، آپ فرمادیجئے کہ تم سے ہمارے جرم کی باز پرس نہ ہوگی اور ہم سے تمہارے اعمال کی باز پرس نہ ہوگی)۔

اس ارشاد باری میں دیکھو کہ مسلمانوں واہل حق کے بارے میں آیا ہے:

"لا تسئلون عما أجرمنا" (تم سے ہمارے جرم کا سوال نہ ہوگا)۔

کہ مسلمانوں کی طرف جرم کی نسبت کی گئی ہے، اور کفار جو واقعی وحقیقی مجرم ہیں ان کی نسبت سے فرمایا گیا ہے: "ولا نسئل عما تعملون" (اور ہم سے تمہارے اعمال کی باز پرس نہ ہوگی) کہ ان کی طرف عمل کو منسوب کیا ہے، یہ دراصل مخالف سے بطور تنزل بات کرنے کی حکمت ہے۔

جیسے اس سے پہلے کی آیت میں یہ فرمانا: "وإنا أو إياكم لعلى هدى أو في ضلال مبين" (ہم یا تم یقیناً راہ راست یا گمراہی پر ہیں)۔

یہ بھی علی سبیل التنزل اور علی وجہ الحکمۃ ہے (کہ مخالف کو نرم کیا جائے اور دل سے متوجہ کیا جاسکے)۔

نیز حق تعالی کا ارشاد ہے:

"عسى ربكم أن يرحمكم وإن عدتم عدنا وجعلنا جهنم للكافرين حصيراً" (سورہ اسراء:۸۰)۔

(عجب نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمادے، اور اگر پھر وہی (شرارت) کروگے تو ہم بھی پھر وہی کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کا جیل خانہ بنا رکھا ہے)۔

ایسے ہی یہ بھی ارشاد باری تعالی ہے:

"إن ربك هو أعلم بمن ضل عن سبيله وهو أعلم بالمهتدين" (القلم:۷)۔
(آپ کا پروردگار اس کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ راہ راست پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے)۔

انسان کے اندر سکون وسکینت، اس کے نفس کا ٹھہراؤ، اس کی زبان کی نرمی، اس کے لفظوں کا حسن اور اس کی دلیل کی قوت، یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کے سامنے دل پگھلتے ہیں اور جن کے لئے دل ڈھلتے ہیں اور ان کے ذریعہ صاحب حق کی زبان سے حق دوسروں کے دلوں تک پہنچتا ہے اور اس کا حق ان کے باطل کو مغلوب کر لیتا ہے۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ امت دوسری امتوں کے لئے مضحکہ بنے، بالخصوص اب کہ آج ہم ٹکنالوجی اور لاسلکی عہد میں ہیں اور سارا عالم ایک چھوٹے سے گاؤں کی طرح ہو گیا ہے کہ آج دور دراز کا آدمی بھی قریب والے کی بات کو سنتا ہے۔

جو مسائل کوئی فائدہ نہیں رکھتے آج ان کی بابت ہمارے درمیان شدید و بے ثمرہ بحث ومباحثہ کا ایک سلسلہ ہے اور دور وقریب کے ہمارے دشمنوں ومخالفوں کے علم ومشاہدہ میں رہنے والے ہمارے ان حالات نے یہ موقع دیا ہے کہ آج لوگ ہم سے یہ کہہ رہے ہیں کہ پہلے تم خود اس دین پر متفق ہو جاؤ جس کو ہمارے سامنے اور ہمارے لئے پیش کر رہے ہو اور اس تصور وفکر کو تم اپناؤ جس کو تم اپنا بتا رہے ہو پھر ہم کو دعوت دینے کے لئے آگے آؤ اور یہ بہترین افکار ونظریات جن کی تم باتیں کرتے ہو دوسروں کو ان کی دعوت دینے سے پہلے خود ان کا التزام واہتمام کرو، اور عالم کی مشکلات کو حل کرنے کی فکر وبات سے پہلے خود اپنی مشکلات کو حل کرو۔

کچھ دنوں قبل مجھے ایک مضمون لکھنے کا اتفاق ہوا جس کا عنوان تھا "بيني وبين ابن جبرين" (میرے اور ابن جبرین کے درمیان- ابن جبرین ایک بڑے عرب عالم ہیں) اس مضمون کا تعلق بعض ایسے مسائل سے تھا جن کی بابت بعض اہل سنت کے درمیان اختلاف ہے۔

میرا خیال یہ تھا کہ اس مضمون کی بازگشت میرے رفقاء واحباب اور آس پاس کے لوگوں سے دور نہ سنی جائے گی، لیکن غیر متوقع طور پر یہ ہوا کہ کئی امریکی مردوں وعورتوں کی طرف سے ردعمل میرے سامنے آیا حالانکہ وہ نہ عرب ہیں اور نہ مسلمان، میں نے محسوس کیا کہ وہ صرف لکھی ہوئی سطریں ہی نہیں پڑھتے بلکہ بین السطور وماوراء السطور بھی پڑھتے ہیں اور پڑھے ہوئے پر نوٹ بھی لگاتے ہیں جس سے ان کے گہرے مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے اور اس بات کا بھی کہ بہت سے مسائل میں ان کی توجہ اور ان کا علم کہیں زیادہ ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض ایسے لوگوں سے بھی زیادہ جو بظاہر ایسے مسائل میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔

(۳)

اختلاف کا ایجابی نفع

اختلاف ایک ربانی نظام ودستور ہے، جس سے چھٹکارا نہیں ہے کہ انسان رنگ، شکل، خاندان، رجحانات اور عقل وفہم، ہر چیز میں اختلاف رکھتے ہیں، ابوطیب متنبی کہتا ہے:

تخالف الناس حتی لا اتفاق لهم

(لوگوں میں ایسا اختلاف ہے کہ ان میں کوئی اتفاق نہیں رہ گیا)

إلا على شجب والخلف في الشعب

(البتہ موت پر اتفاق ہے اور موت کے بارے میں بھی اختلاف ہے)

فقيل تخلص نفس المرء سالمة

(بعض لوگ کہتے ہیں کہ (موت کے بعد) انسان کی روح محفوظ رہتی ہے)

وقيل تشرك جسم المرء في العطب

(اور بعض کہتے ہیں کہ روح بھی جسم کے ساتھ موت میں شریک ہوتی ہے)۔

حق تعالی کا ارشاد ہے:

"ومن آياته خلق السموات والأرض واختلاف ألسنتكم وألوانكم إن في ذلك لآيات للعالمين" (الروم:۲۲)۔

(اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا بنانا ہے اور تمہارے لب ولہجہ اور رنگوں کا الگ ہونا ہے اس میں دانشمندوں کے لئے نشانیاں ہیں)۔

نیز ارشاد ہے:

"ومن کل شيئ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون" (الذاریات:۴۹)۔

(اور ہم نے ہر چیز کو دو دو قسم بنایا تا کہ تم (ان مصنوعات سے توحید کو) سمجھو)۔

اور ارشاد ہے:

"یاأیھا الناس إنا خلقناکم من ذکر وأنثی وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا" (الحجرات:۱۳)۔

(اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو)۔

اس آیت میں حق تعالی نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے تم کو مختلف جماعتوں میں بنایا تا کہ تم آپس میں لڑو اور جھگڑو اور جنگ کرو، بلکہ فرمایا: "لتعارفوا" (تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو)۔

اور تعارف صرف جاننے و پہچاننے کا نام نہیں ہے، بلکہ "معروف کے ساتھ معاملہ کرنا" اور معروف نام ہے نیکی و انصاف کا اور احسان و سلوک کا۔

کائنات کا قیام اور نظام حیات کا بقاء انسانوں کی کسی ایک خاص و متعین جماعت کی خواہش و کوشش کے ساتھ مرتبط نہیں ہے، ورنہ تو یہ جماعت یہی چاہتی کہ دوسروں کو ختم کر دے اور وجود سے مٹا دے، اور ہر جماعت دوسری جماعت کی خواہش کے عکس کی ہی طالب و خواہش مند ہوتی۔

انسان کا آج ایک حال ہے اور کل آئندہ کچھ اور حال ہوگا، جیسا کہ ہمارے پروردگار نے فرمایا ہے:

"لترکبن طبقاً عن طبق" (الانشقاق:۱۹) (تم لوگوں کو ضرور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پہنچنا ہے)۔

اور کبھی اس کی آج کی کوشش ایک رخ کی اور کل کی دوسرے رخ کی ہوتی ہے، ارشاد ربانی ہے:

"إن سعيكم لشتى" (الليل:۴) (بے شک تمہاری کوششیں مختلف ہیں)۔

انسان بچپن وجوانی، کہولت، وسن درازی اور بڑھاپے سب سے گذرتا ہے، اور غنی وفقر، صحت ومرض سب کا سامنا کرتا ہے، اور وہ نقص فہم نیز اعتدال مزاج اس سب کے ساتھ متصف ہوتا ہے، اور اس پر مختلف قسم کے حالات کے تحت بھی بعض آثار ظاہر وطاری ہوتے ہیں، ذاتی وشخصی حالات، نیز عائلی واقتصادی حالات اور یہ حالات اس کے معاملات سکون وقرار، مساعی وفیصلے، سب میں سلبی وایجابی اثر دکھاتے ہیں، جبکہ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ایک سمجھدار وزیرک آدمی برابر اس جدوجہد میں رہتا ہے کہ افضل وبہتر کیا چیز ہے، نیز حق اور زیادہ صحیح کیا چیز ہے، وہ کسی عادت کا اسیر نہیں ہوتا، اور نہ ہی لذات کے لئے یا دوسروں کے لئے تقلیدوں کا قیدی بنتا ہے حتی کہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے:

"إني والله إن شاء الله لا أحلف على يمين فأرى غيرها خيراً منها إلا كفرت عن يميني وأتيت الذي هو خير" (بخاری:۶۶۲۳، مسلم:۱۶۴۹، واللفظ لہ عن ابی موسی الاشعریؓ)۔

(بخدا میرا معاملہ تو یہ ہے کہ میں انشاء اللہ اگر کوئی قسم کھالوں اور اس کے بعد دوسرے پہلو کو زیادہ بہتر دیکھتا ہوں تو اپنی قسم کا کفارہ دیدیتا ہوں اور اس کام کو کر گذرتا ہوں جو بہتر ہوتا ہے)۔

آپ نے اپنا حال یہ بتایا کہ آپ کسی وقت ایک چیز کو بہتر سمجھ کر قسم کھالیتے ہیں -میرے ماں وباپ آپ پر قربان ہوں- اس کے بعد آپ کو دوسری بات بہتر معلوم ہوتی ہے اور اپنی قسم کا کفارہ دیدیتے ہیں اور اس کام کو کرلیتے ہیں جس کو بعد میں بہتر سمجھتے ہیں اور ایسا ہوتا ہے

کہ ایک آدمی ایک رائے کو صحیح بہتر ومناسب خیال کرتا ہے اور شام کو اس کے خلاف کرتا ہے۔

اور یہ بھی ربانی حکمت کا ایک کرشمہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالی نے انسان کو اختیار کا ایک خاص حق دیا ہے، جیسا کہ خود فرمایا ہے:

"وقل الحق من ربكم فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر" (الکہف:۲۹)۔

(اور آپ کہہ دیجئے کہ یہ (دین) حق تمہارے رب کی طرف سے (آیا) ہے، سو جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کافر رہے)۔

نیز ارشاد ہے: "وهديناه النجدين" (البلد:۱۰) (اور ہم نے اس کو دونوں راستے (خیر وشر کے) بتا دیئے)۔

اور حق تعالی نے اس اختیار کے نتیجہ میں اس کے لئے ایک چیز رکھی ہے، یا تو جنت جس کی چوڑائی آسمان وزمین کی ہے یا دہکتی ہوئی آگ۔

"إنا أعتدنا للظالمين ناراً أحاط بهم سرادقها وإن يستغيثوا يغاثوا بماء كالمهل يشوي الوجوه بئس الشراب وساءت مرتفقا" (الکہف:۲۹)۔

(بے شک ہم نے ایسے ظالموں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے کہ اس (آگ) کی قناتیں ان کو گھیرے ہوں گی، اور اگر (پیاس کی وجہ سے) فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے ان کی فریادرسی کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا، مونہوں کو بھون ڈالے گا، کیا ہی برا پانی ہوگا اور دوزخ بھی کیا ہی بری جگہ ہوگی)۔

اور اگر اللہ سبحانہ وتعالی چاہتا تو ہم کو اور سارے انسانوں کو فرشتہ بناتا کہ سب کے سب اسی کے مطیع وفرمانبردار ہوتے۔

"لا يعصون الله ما أمرهم ويفعلون ما يؤمرون" (التحریم:۶) (وہ خدا کی نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو ان کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو بجالاتے ہیں)۔

لیکن اس نے ایسی مخلوق کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا کہ جس کو وہ آزمائے یعنی آزمائش وامتحان میں ڈالے، جیسے کہ فرمایا ہے:

"ولکن لیبلو بعضکم ببعض" (محمد:۴) (لیکن یہ حکم اس لئے ہے کہ ایک کا دوسرے کے ذریعہ امتحان کرلے)۔

اور یہ آزمائش محض یہ نہیں کہ میدان جنگ وقتال میں ان کو کھڑا کیا جائے بلکہ ساری زندگی کے میدان میں آزمانا مقصود ہے، اسی لئے اللہ تعالی نے ہمارے لئے یہ حکم رکھا ہے کہ ہم قتل وجنگ اور ذبح سب میں احسان (اچھائی اور اچھی روش) کو اختیار کریں۔

حضرت شداد بن اوسؓ کی حدیث میں ہے: میں نے دو باتیں رسول اللہ ﷺ سے محفوظ کی ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"إن الله كتب الإحسان على كل شيء فإذا قتلتم فأحسنوا القتلة وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبح وليحد أحدكم شفرته وليرح ذبيحته" (مسلم:۱۹۵۵، واللفظ لہ، ابوداؤد:۲۸۱۵، نسائی:۴۴۱۲، ترمذی:۱۴۰۹)۔

(اللہ نے ہر چیز کے حق میں اچھائی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، لہذا جب (کسی کو) قتل کرو تو اچھی طرح قتل کیا کرو، اور جب ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو، لہذا اپنی چھری تیز کرلیا کرو اور اپنے ذبیحہ کو راحت پہنچایا کرو)۔

یہ احسان (خوش روی) کا ایسا نمونہ ہے کہ جس تک انسان کا ذہن جا ہی نہیں سکتا اور وہ یہ کہ اگر کوئی آدمی قتل کا مستحق ہے تو اس کو قتل کرنے میں احسان کو اپنایا جائے، یا کسی ضرورت سے کسی جانور کو ذبح کرنا ہے تو اس میں احسان کو اختیار کیا جائے۔

اسی طرح اللہ تعالی نے زوجین کے درمیان، پڑوسیوں کے درمیان، شرکاء کے درمیان۔ احسان-خوش روی وحسن سلوک- کا حکم دیا ہے، سارے انسانوں کے لئے-قریبی ہوں یا دور کے-

اخلاق ومعاملات کی بنیادیں وضع کی ہیں۔

جیسے کہ اللہ نے دعوت کے کام میں خوش اسلوبی کو مشروع کیا ہے، نیز دلوں کو خیر کے کاموں میں جوڑنے، انسانوں کے لئے ہدایت کو محبوب بنانے میں بھی اس کا حکم دیا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے زکاۃ کے اندر ایک حصہ مؤلفۃ القلوب کا بھی رکھا ہے جن میں (ایک رائے کے مطابق) وہ کافر بھی ہے جس سے اسلام کی امید ہو یا جس کے شر کے دفعیہ کی امید ہو، یا اس جیسے آدمی کے اسلام کی توقع ہو، اور وہ مسلمان بھی ہے کہ جس کے ایمان کی قوت کی امید ہو اور مطلوب ہو۔

جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے احسان - اچھائی کو خود احسان یعنی اچھائی - کے لئے مشروع کیا ہے اگر چہ اس کا مقصد دعوت دینا نہ ہو حتی کہ اگر چہ اس کا ارتکاب نیت وعبادت کے استحضار وخیال کے بغیر ہی ہو، جیسے کہ جانور کو ذبح کرنے میں احسان واچھائی والی حدیث میں آیا ہے، اور جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وافعلوا الخير لعلكم تفلحون" (الحج:۷۷) (اور نیک کام کیا کرو، امید ہے کہ تم فلاح پاؤگے)۔

حق تعالیٰ نے اپنے نبی محمد ﷺ کی تعریف میں فرمایا ہے:

"وإنک لعلی خلق عظیم" (القلم:۴) (اور بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ پیمانے پر ہیں)۔

تو یہ تعریف محض اس بنیاد پر نہیں تھی کہ آپ کے اخلاق انہیں لوگوں میں منحصر تھے جن کو دعوت دیتے اور جن کی طرف سے دعوت کے قبول کرنے کی آپ خواہش وامید رکھتے تھے بلکہ آپ کا معاملہ تو یہ تھا کہ آپ بعثت سے پہلے سے اور پہلے بھی خاص وعام سب کے حق میں اور سب کے ساتھ حسن خلق کے معاملہ میں ایک اعلیٰ نمونہ ومثال تھے۔

کے لئے اوراس میں جدوجہد اور گھومنے وپھرنے کے لئے پیدا کیا، اس لئے ملائکہ نے اپنے پروردگار سے عرض کیا:

"أتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک" (البقرہ:۳۰) (کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جوفساد کریں گے اورخونریزیاں کریں گے اورہم برابر۔ بحمداللہ۔ آپ کی تسبیح وتقدیس کرتے رہتے ہیں)۔

فرشتوں نے یہ اس لئے عرض کیا کہ ان کو معلوم تھا کہ اللہ عزوجل کوزمین میں فساداور خونریزی پسندنہیں ہے، اوراللہ نے نہ تو اس لئے انسان کو پیدا کیا ہے اورنہ اس غرض سے کتابوں کو نازل فرمایا ہے۔

شریعتیں پانچ معروف ضرورتوں کی حفاظت کی غرض سے نازل ہوئی ہیں اور ان چیزوں کی حفاظت کے لئے جوان پانچوں سے ملحق ومتعلق ہیں، اور جوشرعی مقاصد ومقصدیت کی روسے ان کے مماثل ومشابہ ہیں مثلاً: قتل، زنا، جھوٹ، چوری، ظلم وغیرہ کی حرمت۔

اوراس آخری شریعت نے انسانوں کے حقوق کی پورے طور پر حفاظت کی ہے، اس صورت میں بھی ان کے حقوق کے لحاظ کا مسئلہ ہے جبکہ باہم اختلاف ہو، اللہ تعالی نے انسان کو ایک بااختیار مخلوق بنایا ہے، اوراس کو خیروشر نیز ہدایت وگمراہی میں سے جس چیز کے لئے پیدا کیا ہے اس کے حق میں اس کے لئے آسانی وسہولت کا بھی نظام بنایا ہے، حدیث میں آیا ہے:

"اعملوا فکل میسر لما خلق لہ" (بخاری:۴۹۴۹، مسلم: ۲۶۴۷ عن علی بن ابی طالبؓ)۔ (عمل میں لگے رہو کہ ہرایک کے لئے اس چیز میں سہولت دی جاتی ہے جس کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہے)۔

اللہ تعالی نے حق واسلام کے دائرہ میں اختلاف کو مقبول اورسبب اجر بنایا ہے، بشرطیکہ اختلاف متعینہ حدود کے اندر ہو، اوراختلاف کرنے والا اچھی نیت کا حامل ہو، اورخودکوحتی الوسع

اور نبی بنائے جانے اور آپ پر وحی کے نزول کے بعد تو آپ اس سے کہیں زیادہ مختلف ہو گئے جیسا کہ پہلے لوگوں نے آپ کو پایا اور دیکھا تھا کہ اسی حال میں آپ نے یہ فرمایا ہے:

"في كل كبد رطبة أجر" (بخاری: ۲۳۶۳، مسلم: ۲۲۴۴ عن ابی ہریرہؓ) (ہر تر کلیجے میں (اللہ نے) اجر (رکھا) ہے)۔

اور فرمایا:

"والشاة إن رحمتها رحمك الله" (احمد: ۱۵۶۳۰، بخاری: الادب المفرد: ۳۷۳، طبرانی فی الکبیر: ۱۹/ ۲۲، ۲۳، حاکم: ۴/ ۲۵۷)۔

(بکری پر بھی۔ اگر تم رحم کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ رحم کا معاملہ کرے گا)۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ نے آپ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بدکار عورت کی مغفرت اس وجہ سے فرمادی کہ وہ ایک کتے کے پاس سے گذری، کتا ایک کنویں کے کنارے کھڑا تھا اور شدت پیاس سے زبان باہر کو نکالے ہوئے تھا، اور کیفیت یہ تھی کہ اندیشہ تھا کہ پیاس اس کی جان لے لے، اس عورت نے اپنے خف کو اتارا، اپنے دوپٹے سے اس کو باندھا، اور پھر اس کے ذریعہ اس کتے کے لئے (کنویں سے) پانی نکالا (اور کتے کو پلایا) بس اس وجہ سے حق تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی (بخاری: ۳۳۲۱، واللفظ لہ، مسلم: ۲۲۴۵)۔

دین اس لئے نہیں آیا ہے کہ انسانوں کے درمیان نزاع، اختلاف ودوری کو بڑھائے اور بھڑکائے، بلکہ ان کے درمیان رابطہ پیدا کرنے، اس کو مضبوط ومنظم کرنے اور اس طرح زمین کو آباد رکھنے کے لئے آیا ہے، ارشاد ہے:

"هو أنشأكم من الأرض واستعمركم فيها" (ہود: ۶۱) (اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور تم کو زمین میں آباد کیا)۔

یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جب پیدا کیا تو زمین کو آباد کرنے

خواہشات نفس کی پیروی سے محفوظ رکھے۔

کائنات کو پیدا کرنے والا خوب جانتا تھا کہ یہ انسان اختلاف کریں گے اور یہ اختلاف ان کی عقل وفکر کے اختلاف، صلاحیتوں میں فرق، نیز مقاصد وعواقب (انجام ومآل) کی فقہ کے علم میں اور مصالح کو سمجھنے واولویات کی رعایت ولحاظ میں فرق کی وجہ سے ہوگا۔

کبھی لوگوں میں اختلاف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ان کی نفسیات، رجحانات، مزاج میں فرق ہوتا ہے، یا یکسوئی واخلاص سے کام لینے وکام کرنے میں فرق ہوتا ہے نیز آدمی پر اثر انداز ہونے والے امور سے خود کو دور رکھنے و بچانے کی صلاحیت ومزاج میں فرق ہوتا ہے، خواہ وہ مؤثر امور نفسیاتی ہوں یا اجتماعی وسیاسی یا کسی اور طرح کے ہوں۔

اور کبھی اس وجہ سے بھی اختلاف ہوتا ہے کہ علم ومعرفت کی مقدار میں قلت وکثرت، نیز صحت وضعف کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے۔

یہ اختلاف اپنی اصل وذات میں رحمت اور وسعت ہے، پریشانی وتنگی اس وقت ہوتی ہے جب کہ اس کے ساتھ نفسانی خواہشات اور حظ نفس کی آمیزش ہو جائے، یا اس کے ساتھ غیر شرعی انداز کا معاملہ کیا جائے، ایسی صورت میں یہ اختلاف مسلمانوں کے درمیان افتراق ونزاع کا باعث بن جاتا ہے، اسی لئے جب اسحاق بن بہلول نے ایک کتاب لکھی اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے پاس لے کر آئے اور کہا کہ اس کتاب کا نام میں نے ''کتاب الاختلاف'' رکھا ہے، تو انہوں نے ان سے فرمایا اس کا نام کتاب الاختلاف مت رکھو بلکہ ''کتاب الوسعت'' نام رکھو (ملاحظہ ہو: طبقات حنابلہ ۱/۱۱۱)، یہ ان کی فقاہت کا اثر تھا، حق تعالیٰ ان کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ فرمائے۔

بعض علماء نے صحابہ کے متعلق فرمایا ہے، صحابہ کا اتفاق حجت قطعیہ ہے اور ان کا اختلاف رحمت واسعہ ہے۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا فرمان وارشاد ہے:

"مجھے یہ پسند نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں اختلاف نہ ہوتا، اس لئے کہ اگر (مسائل میں ان کا) ایک ہی قول ہوتا تو لوگ تنگی میں رہتے، اور وہ امت کے ائمہ ہیں جن کی اقتدا کی جاتی ہے تو اگر کوئی آدمی ان میں سے کسی ایک کے قول کو بھی لے لے گا اور اس پر عمل کرے گا، تو وہ وسعت میں رہے گا (ابن عبد البر فی جامع بیان العلم وفضلہ: ۱۶۸۹، اور ملاحظہ ہو: مجموع الفتاوی ۳۰/۸۰، الموافقات للشاطبی ۴/۱۲۵)۔

انسانوں کو جب اپنے معاملات خرید وفروخت میں حساب کی ضرورت ہوئی تو حساب کے اصول وضوابط اور قواعد بنے، اور جب ان کو اپنی بول وچال اور گفتگو میں نحو کی ضرورت پڑی تو نحو واعراب کے قواعد سامنے آئے، اسی طرح آپسی اختلاف چونکہ ایک قطعی چیز ہے (ہو کر رہنے والی، نہ ہونے کا سوال نہیں) تو اس کی ضرورت ہوئی کہ ایسے قواعد وضوابط وجود میں آئیں جن پر اختلاف کرنے والے چلا کریں تا کہ اختلاف باہمی نزاع کا باعث وسبب نہ بنے، کہ لوگوں کی اخلاقی اور عنادی وفسادی خرابیوں کی پردہ دری ہو اور اس کی وجہ سے حق اور اس کی نصرت، نیز دین اور اس کی حمایت مٹی میں مل جائے اور یہ چیز دوسروں سے پہلے خود ایسی باتیں کرنے والوں کو لے ڈوبے۔

(۴)

اختلاف کے اخلاقیات

(۱) اختلاف کرنے والوں کے درمیان لعنت وملامت سے گریز:

تمہارا اگر کسی سے اختلاف ہے تو خود کو قطعی طور پر اس سے اچھے ومضبوط ایمان والا، نیز وسیع علم وپختہ عقل والا مت سمجھو۔

یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ نے فرمایا:

"فتوی دینے والوں سے فتاوی ومسائل کا سوال ہمیشہ ہوتا رہا اور وہ جواب دیتے رہے، ایک نے ایک چیز کو حلال اور دوسرے نے اسی کو حرام کہا، لیکن حرام قرار دینے والے نے یہ نہیں سمجھا کہ حلال کہنے والا اس وجہ سے تباہ ہو گیا اور نہ حلال کہنے والے نے یہ گردانا کہ حرمت کا فتوی دینے والا اس کی وجہ سے برباد ہو گیا" (ابن عبد البر: جامع بیان العلم وفضلہ: ۱۶۹۱)۔

امام احمد رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

"بغداد کا پل پار کر کے خراسان کی طرف اسحاق بن راہویہ جیسا آدمی نہیں آیا، اگرچہ وہ بعض چیزوں میں ہم سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں کہ لوگ تو آپس میں برابر اختلاف کرتے رہے ہیں" (ابن عساکر: تاریخ دمشق ۸/۱۲۸، خطیب بغدادی: تاریخ بغداد ۶/۳۴۸)۔

لوگوں کی عقل وفہم وحی نہیں ہے، اور فقہی وتحریکی ادارے ہی اسلام نہیں ہیں، ہاں اسلام کی طرف سب نسبت ورجوع رکھتے ہیں۔

حدیث میں حضرت بریدہ بن حصیب ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی

چھوٹے یا بڑے لشکر پر کسی کو امیر بناتے تو اس کو اپنی ذات کے حق میں اور اپنے ساتھ کے مسلمانوں کے حق میں حق تعالی سے ڈرنے اور خیر کی وصیت کرنے کے ساتھ فرماتے:

"جب تم کسی قلعہ والوں کا محاصرہ کرنا اور وہ تم سے یہ چاہیں کہ تم ان سے اللہ اور اس کے نبی کے ذمہ کا اور اس بنیاد پر معاملہ کرو تو تم ایسا نہ کرنا بلکہ اپنے ذمہ اور اپنے ساتھیوں کے ذمہ کی بات کرنا، اس لئے کہ تم اپنے ذموں کی اور اپنے ساتھیوں کے ذموں کی خلاف ورزی کرو، یہ اس سے بہتر ہے کہ تم اللہ کے ذمہ اور اس کے رسول کے ذمہ کی خلاف ورزی کرو۔

اور اگر تم کسی قلعہ والوں کا محاصرہ کرو اور وہ تم سے یہ چاہیں کہ تم ان کو قلعہ سے اللہ کے حکم کی بنیاد پر اتارو تو اللہ کے حکم کی بنیاد پر ان کو مت اتارنا بلکہ اپنے حکم وفیصلہ کی بنیاد پر اتارنا، اس لئے کہ تم نہیں جانتے کہ ان کے حق میں اللہ کے حکم کو اپنا بھی سکو گے اور جان سکو گے کہ نہیں"

(مسلم: ۱۷۳۱)۔

رسول اللہ ﷺ نے اس موقع سے اپنے رفقاء میں سے ایک ایسے شخص کو اس قسم کی وصیت فرمائی ہے جس کو آپ نے لشکر وفوج کی قیادت کے لئے چنا اور آپ ابھی ان کے درمیان ہی ہیں (کہ باحیات ہیں) اور پھر بھی فرمارہے ہیں:

لوگوں کو اللہ کے حکم پر مت اتارنا اور نہ اس کے رسول کے حکم پر اس لئے کہ تم یہ نہیں جان سکو گے کہ ان کے حق میں تم اللہ کے حکم پر اور اس کے رسول کے حکم پر عمل کرسکے یا نہیں۔

اور بعض ایسے مسائل جو زیادہ سے زیادہ اجتہادی کہے جاسکتے ہیں، میں نے ایسے مسائل میں خود اپنے کانوں سے بعض کہنے والوں کو یہ کہتے سنا:

میں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتا اور نہ میں اپنی رائے سے بولتا ہوں، یہ تو (جو میں کہہ رہا ہوں اور بتارہا ہوں) اللہ کا منہج وطریقہ ہے اور اللہ کا ہی حکم ہے۔

سبحان اللہ! کیا دوسرے لوگ تورات وانجیل سے رائے اختیار کرتے اور لیتے ہیں؟ یا کیا

وہ لوگ دانیال کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں یا اغریق وروما کے فلسفہ سے باتیں اخذ کرتے ہیں؟

ابن القیمؒ فرماتے ہیں: جس رائے تک آدمی اپنے اجتہاد سے پہنچا ہے اور جس کی بابت اس کو اللہ یا اس کے رسول کی طرف سے کوئی نص نہیں مل سکی ہے، آدمی کو اس کی بابت یوں نہ کہنا چاہئے، اللہ نے اس چیز کو حرام کیا ہے یا فلاں چیز کو واجب یا مباح کہا ہے، اسی طرح یہ کہ اللہ کا حکم یہی ہے (اعلام الموقعین ۱/۴۴)۔

ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: بہت سے لوگ اپنی باتوں کو شریعت کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ وہ شریعت کی بات نہیں ہوتی، بلکہ وہ لوگ اس قسم کی بات یا تو جہالت کی بنا پر کرتے ہیں یا غلطی سے یا قصداً وعمداً افتراء کے طور پر کرتے ہیں (مجموع الفتاوی ۳۵/۳۶۶)۔

ابو جعفر منصورؒ نے امام دارالہجرۃ مالک بن انسؒ کے سامنے یہ بات رکھی کہ مؤطا کو تمام عالم اسلام میں پھیلا دیا جائے اور لوگوں کو اسی کے اختیار کرنے اور اس کے مشتملات پر عمل کرنے کا پابند بنا دیا جائے تو امام مالکؒ نے ابو جعفرؒ کو اس سے منع کیا اور فرمایا:

"اے امیر المومنین! آپ ایسا نہ کریں، اس لئے کہ لوگوں کے پاس پہلے سے بہت سے اقوال ہیں اور انہوں نے بہت سی احادیث سن رکھی ہیں وہ بہت سی روایات نقل کرتے ہیں اور ہر قوم کے پاس جو علم پہلے سے پہنچ چکا ہے وہ اس کو پکڑے ہوئے ہے، اور اسی پر اس کا عمل ہے، نیز اسی کو وہ اپنا دین سمجھتے ہیں جس میں ان کا اور دوسروں کا اختلاف بھی ہے اور لوگ جس چیز کے قائل ومعتقد ہیں اس سے ان کو پھیرنا بڑا سخت ہوتا ہے، اس لئے عام لوگ جس چیز پر ہیں ان کو اس پر ہی رہنے دیجئے اور اس پر ان کو چھوڑ دیجئے جس کو ہر شہر وعلاقے کے لوگوں نے اپنے لئے اختیار کر رکھا ہے" (ملاحظہ ہو: الطبقات الکبری ۱/۴۴۰، سیر اعلام النبلاء ۸/۷۸)۔

یہ امام مالک کی فقاہت اور ان کے تقوی کا اثر ونتیجہ تھا ورنہ تو بہت سے اختلاف کرنے والوں کا معاملہ یہ ہے کہ اگر وہ اپنی طرف حاکم کو متوجہ کر سکتے ہوں تاکہ اس سے اپنے مخالفین کے

خلاف اوران پر مدد لیں تو وہ یہ ضرور کریں گے، اور ایسا بہت ہوا ہے کہ فقہی مذاہب کی بنا پر آپس میں اختلاف رکھنے والے بہت سے لوگوں نے یہ کیا ہے کہ حاکم وقت سے اپنے مخالفین و دشمنوں کے خلاف مدد لی ہے، اوران کو عہدہ و منصب سے دور رکھا ہے نیز تکلیفیں پہنچائی ہیں۔

(۲) انصاف:

جیسا کہ حضرت عمار بن یاسرؓ نے فرمایا:

"جو آدمی تین باتوں کو جمع کرلے وہ ایمان کو جمع کر لیتا ہے، اپنے آپ سے انصاف، اور عالم کے لئے سلام (یعنی ہر ایک کے لئے) اور بخل کے موقع میں خرچ" (امام بخاری نے اس کو معلقاً ذکر کیا ہے کتاب الإیمان باب إفشاء السلام من الإسلام اور ابن ابی شیبہ: ۳۰۴۴۰، نیز بیہقی: شعب الایمان (۴۹) نے اس کو موصولاً روایت کیا ہے)۔

انصاف بڑا پسندیدہ خلق ہے جو اس کا تقاضا کرتا ہے کہ تم درپیش معاملہ میں دوسروں کو اپنی جگہ رکھو و سمجھو اور انصاف ایک ضرورت ہے جس کے لئے کچھ عملی معیار و حدود متعین ہیں مثلاً:

الف- جو چیز یقین سے ثابت ہو وہ یقین ہی سے ختم ہوتی ہے:

لہذا جس آدمی کا اسلام ثابت ہو وہ اسلام سے باہر اور کفر کے تحت یقین کی بنیاد پر ہی کیا جاسکتا ہے، اسی طرح جس کا سنت سے تعلق ثابت ہو یقین کے ذریعہ ہی وہ اس سے نکل سکے گا، اسی طرح ہر چیز کا حال ہے کہ کسی کے لئے جب کوئی چیز ثابت ہوگی تو یقین کی بنیاد پر ہی وہ اس سے باہر قرار دی جائے گی۔

ب- ایمان کا حکم لگانے میں خطأ، کفر کا حکم لگانے کی خطا سے اہون ہے:

اگر کسی کے ظاہر حال کو دیکھ کر تم اس کے اسلام کا حکم لگاؤ تو اگر چہ وہ منافقین میں سے کیوں نہ ہو، یہ اس سے اہون ہے کہ تم جلد بازی سے کام لیتے ہوئے کسی مسلم پر کفر کا حکم لگاؤ،

جبکہ وہ ایسا نہ ہو اور ایسی صورت میں تم اس وعید کا مصداق ہو گئے، جو نبی ﷺ سے منقول ہے:

''اگر کوئی آدمی کسی کو کفر کے ساتھ پکارتا ہے یا اللہ کا دشمن کہتا ہے اور وہ ایسا نہیں ہے تو اس قسم کا کلمہ کہنے والے پر لوٹتا ہے'' (مسلم: ۶۱ عن ابی ذرؓ)۔

ج- اجتہادی مسائل میں کسی کو گنہگار کہنا یا قطع تعلق - یہ سب صحیح نہیں ہے:

ابن تیمیہؒ نے ذکر کیا ہے کہ اہل سنت کا مذہب یہی ہے کہ جو لوگ اجتہاد کرتے ہیں (اور وہ اس کے اہل ہوتے ہیں) اہل سنت ان کو گنہگار نہیں مانتے اور اس میں وہ اصول وفروع کے درمیان کسی فرق کے قائل نہیں ہیں، لہذا جو آدمی اللہ عزوجل کی مراد کو جاننے وسمجھنے کی پوری کوشش کرے اور وہ اس کا اہل ہو تو وہ اس اجتہاد کی وجہ سے گنہگار نہیں ہوگا، بلکہ وہ ایک اجر اور دو اجر کے درمیان ہوگا، خلاصہ یہ کہ مسائل اجتہاد میں گنہگار قرار دینے کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان قطع تعلق ہی صحیح ہے (ملاحظہ ہو: مجموع الفتاوی ۱۳/۱۲۵)۔

د- کسی فرد معین کو کافر کہنے یا اس کے لئے لعنت سے گریز:

امام احمدؒ جہمیہ کو کافر قرار دیتے تھے، مگر کسی متعین فرد وشخص کو انہوں نے کبھی کافر نہیں کہا، نہ مامون کو اور نہ کسی اور کو، بلکہ مامون کے لئے دعا واستغفار کرتے تھے اور اس نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کے حق میں اس کو انہوں نے معاف کر دیا تھا (ملاحظہ ہو: مجموع الفتاوی ۲۳/۳۴۸)۔

ہ- ظاہر پر اعتماد واعتبار اور باطن کو اللہ کے سپرد کرنا:

نبی ﷺ کا فرمان ہے:

''مجھ کو یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے دل اور پیٹ چیروں (اور دیکھوں)''

(بخاری: ۴۳۵۱ واللفظ لہ، مسلم: ۱۰۶۴، ۱۴۴ عن ابی سعید الخدریؓ)۔

و- جاہلوں کا علماء مسلمین کی تکفیر پر تسلط و جسارت بہت بڑا منکر ہے:

اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ علماء مسلمین کو محض غلطیوں کی بنا پر کافر قرار دینا درست نہیں ہے، بلکہ محض غلطیوں کی وجہ سے تو عامۃ المسلمین کو بھی کافر کہنا و قرار دینا جائز نہیں ہے (ملاحظہ ہو: مجموع الفتاوی ۳۵/۱۰۰)۔

ابن رجبؒ فرماتے ہیں:

''اکثر ائمہ سے بعض مسائل میں غلطیاں ہوئی ہیں لیکن اس سے ان کی امامت و علم پر اثر نہیں پڑتا، پھر اس کا کیا ہوا؟ یہ ان کی تھوڑی بہت خطا ان کے محاسن سے دب گئی اور ان کی کثرت صواب و صحت میں کھو گئی اور ان کے حسن مقصد نیز دین کی نصرت کی وجہ سے اس کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔

اس بات کے درپے ہونا کہ ان کی لغزشیں تلاش کی جائیں اور نکالی جائیں، یہ نہ قابل تعریف امر ہے اور نہ لائق شکر، بالخصوص ایسے مسائل جو ضرورت سے زائد سمجھے جاتے ہوں یوں کہ ان میں خطا و غلطی سے کوئی بڑا نقصان نہیں ہوتا اور نہ غلطیوں کو بیان کرنے سے کوئی خاص نفع ہوتا ہے'' (الرد علی من اتبع غیر المذاہب الاربعہ: ۵۶، ۵۷)۔

اور عجیب بات ہے کہ بہت سے لوگ حرام کے کھانے، شراب پینے سے نیز آزاد و فحش تصویروں کو دیکھنے سے تو بہت بچتے و احتراز کرتے ہیں مگر ان کے لئے یہ بہت گراں ہوتا ہے کہ اپنی زبان کو آبرو ریزیوں سے روک سکیں، چنانچہ اس قسم کے لوگوں کو تم دیکھو گے کہ وہ زندہ و مردہ سب کی عزت و آبرو کی بخیہ ادھیڑتے رہتے ہیں اور اس کی بالکل پرواہ نہیں کرتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

ذہبیؒ فرماتے ہیں:

''ہم عصروں کا ایک دوسرے کے حق میں کلام و تبصرہ لائق اعتناء نہیں بالخصوص جب یہ سمجھ میں آتا ہو کہ اس کے پیچھے عداوت، مذہب یا حسد کا دخل ہے، ان چیزوں سے تو بس وہی بچ

پاتا ہے جس کو اللہ بچالے اور میں نہیں جانتا کہ حضرات انبیاء وصدیقین کے علاوہ کوئی ایسا ہوا ہے جو کسی زمانہ میں ایسی چیزوں سے محفوظ رہا، اور میں چاہوں تو اس بابت دفتر کے دفتر تیار کرسکتا ہوں" (ملاحظہ ہو: لسان المیزان ۱/۲۰۱، ترجمہ ابونعیم اصفہانی)۔

امام احمد بن حنبلؒ نے بعض طلباء سے دریافت فرمایا کہ کہاں سے آرہے ہو؟ انہوں نے کہا: ابو کریب کی مجلس سے، ابو کریب کا معاملہ یہ تھا کہ وہ امام احمدؒ کو برا بھلا کہتے تھے اور بعض مسائل کی وجہ سے ان پر تنقید کرتے تھے، بہر حال امام احمدؒ نے فرمایا: ان سے احادیث لکھا کرو کہ وہ شیخ صالح ہیں، اس پر ان طلباء نے کہا کہ وہ آپ کے اوپر اعتراض کرتے ہیں؟ فرمایا: میں کیا کرسکتا ہوں، آدمی نیک ہیں مگر میری وجہ سے آزمائش میں پڑ گئے (تاریخ دمشق: ۵۵/۵۸)۔

اعمش نے زر بن حبیش اور ابو وائل کے متعلق ذکر کیا ہے کہ زر علوی تھے، حضرت علی کے محب، اور ابو وائل عثمانی حضرت عثمانؓ کے محب (اور گویا امویوں سے تعلق رکھنے والے)، لیکن دونوں میں حق تعالی کی ذات کی نسبت سے بے انتہاء محبت تھی اور پوری زندگی موت تک ان دونوں نے کبھی ایک دوسرے کے حق میں کچھ نہیں کہا، اور یہ بھی ہے کہ ابو وائل نے زر کے سامنے کبھی حدیث بیان نہیں کی، اس لئے کہ زر عمر میں ابو وائل سے بڑے تھے (ملاحظہ ہو: طبقات کبری ۶/۱۰۵، تہذیب التہذیب ۳/۲۷۷)۔

ذہبیؒ نے ابو محمد بن حزم- صاحب محلی اور شیخ ظاہریہ- کے ترجمہ میں لکھا ہے:

"مجھ کو ابو محمد سے تعلق ہے، اس لئے کہ ان کو حدیث صحیح سے بہت تعلق وواقفیت ہے، اگر چہ ان کی بہت سی باتیں ہیں جو انہوں نے رجال حدیث اور علل سے متعلق کہی ہیں، اسی طرح اصول وفروع کے بہت سے عجیب وغریب ان کے مسائل ہیں اس سب میں، میں ان کی موافقت نہیں کرتا، اور بہت سے مسائل کے اندر میں ان کو قطعاً غلط وخطا کار سمجھتا ہوں لیکن میں نہ تو ان کی تکفیر کرتا ہوں اور نہ ان کو گمراہ کہتا ہوں بلکہ ان کے لئے عفو وچشم پوشی کی امید رکھتا ہوں، اور اسی

طرح تمام مسلمانوں کے لئے اور میں ان کی قوت ذہانت نیز وسعت علم کا قائل و معترف ہوں"

(ملاحظہ ہو: سیر اعلام النبلاء ۱۸/ ۲۰۱، ۲۰۲)۔

انصاف یہ ہے کہ تمہارے فریق مخالف کے پاس جو حق وصواب ہو اس کو تم قبول کرو، خواہ وہ فاسق کیوں نہ ہو، یا یہ کہ بدعتی ہو، بلکہ کافر بھی ہو تب بھی یہی ہونا چاہئے۔

ابن تیمیہؒ نے سنت سے تعلق رکھنے والے بعض حضرات پر اس وجہ سے انکار و نکیر کا ذکر کیا ہے کہ وہ لوگ فلاسفہ سے وحشت و نفرت کی بنا پر ان کی حق باتوں میں بھی ان سے موافقت نہیں کرتے تھے، یا یہ کہ اہل بیت کے فضائل سے اعراض کرتے تھے چنانچہ شیخ فرماتے ہیں:

"کوئی یہودی یا عیسائی - چہ جائیکہ رافضی - اگر کوئی حق بات کہے تو ہمارے لئے جائز نہیں کہ ہم اس کو چھوڑ دیں یا یہ کہ پورے طور پر اس کو رد کریں، بلکہ اس کی بات کا جو حصہ باطل ہوگا ہم اسی کو رد کریں گے، جو حق ہوگا اس کو رد نہیں کریں گے" (ملاحظہ ہو: منہاج السنہ ۲/ ۳۴۲)۔

شیخ عبدالرحمٰن سعدیؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اگر کوئی عالم اہل بدعت کی باتوں سے متعلق گفتگو کرے تو اس پر لازم ہے کہ ہر ذی حق کے حق کا لحاظ کرے، اور ان کی باتوں میں جو حق اور جو باطل ہے اس کو واضح کرے، اور ان کی باتوں میں حق سے قرب و بعد کا خیال کرے" (ملاحظہ ہو: تفسیر سعدی/ ۲۸۰، سورہ انعام: ۱۵۲)۔

ان تصریحات کو دیکھو کہ کس طرح ان میں عدل و انصاف کی علامات روشن ہیں حتی کہ ان لوگوں کے حق میں بھی جو ہمارے مخالف اور ہم سے دور ہوتے ہیں چہ جائیکہ ان کے حق میں جو آپس میں محبت کرنے والے بھائی ہوتے ہیں اور ہوں۔

۳- صبر و نرمی اور مدارات و رواداری کا استعمال نیز ایذاء پر تحمل اور برائی کا اچھائی سے مقابلہ و جواب:

اللہ تعالیٰ نے اس سب کا حکم اپنی کتاب میں کئی جگہ دیا ہے، مثلاً فرمایا ہے:

”ولا تستوی الحسنة ولا السيئة ادفع بالتی ھی أحسن فإذا الذی بینک وبینه عداوة کأنه ولی حمیم“(فصلت:۳۴)۔

(اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی، آپ نیک برتاؤ سے -بدی کو- ٹال دیا کیجئے، پھر یکا یک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے کوئی دلی دوست)۔

نبی اکرم ﷺ نے اسی طرح اپنے دشمنوں کے دلوں کو نرم و مائل کیا، اوران کی شدت ونفرت ودوری کا اسی سے علاج کیا، یہاں تک کہ آپ کے لئے دل نرم و مطیع ہو گئے اور حق کو قبول کر لیا۔

اچھی بات، مخلصانہ اور سچی مسکراہٹ اور دوسروں کے ساتھ قول و فعل سے اچھا سلوک، بلا شبہ یہ سب چیزیں آپسی عداوت کو دور کرنے اور دلوں کو قریب کرنے کے اسباب میں سے ہیں حق تعالی کا ارشاد ہے:

”وما یلقها إلا الذین صبروا وما یلقها إلا ذو حظ عظیم“(فصلت:۳۵)

(یہ بات انہیں کو حاصل ہوتی ہے جو بڑے مستقل مزاج ہوتے ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے)۔

امام ابوحنیفہؒ نے جب تدریسی سلسلہ شروع کیا تو مساور وراق نے ان کے بارے میں کہا:

کنا من الدین قبل الیوم فی سعة

(ہم لوگ دین کی نسبت سے آج سے پہلے وسعت میں تھے)

حتی بلینا بأصحاب المقاییس

(حتی کہ قیاس کرنے والوں کی بنا پر آزمائش میں پڑ گئے)

قوم إذا اجتمعوا صاحوا کأنهم

(یہ لوگ ایسے ہیں کہ جب (کہیں) جمع ہوتے ہیں تو اس طرح چیختے ہیں جیسے کہ وہ)

ثعالب ضبحت بین النواویس

(لومڑیاں ہیں جو قبروں کے درمیان بھونک رہی ہیں)

امام صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو مساور کے پاس کچھ مال بھیجا اور مساور نے اس مال کو لے لیا اور اس کے بعد مساور نے کہا:

إذا ما الناس یوما قایسونا – بآبدة من الفتیا طریفة

(جب لوگ کسی دن ہم سے قیاس میں مقابلہ کریں کسی نئے وعجیب پیش آمدہ مسئلہ میں)

أتیناهم بمقیاس صحیح – مصیب من طراز أبی حنیفة

(ہم ان لوگوں کے سامنے قیاس صحیح پیش کریں گے جو درست ہوگا امام ابی حنیفہؒ کے قیاس کے انداز پر)

إذا سمع الفقیه بها وعاها – وأثبتها بحبر فی صحیفة

(جو فقیہ اس کو سنے گا یاد کرلے گا اور اس کو روشنائی سے کاغذ میں لکھ لے گا)

عداوت کو ختم کرنے اور دلوں کو قریب کرنے کے اسباب میں یہ بھی ہے کہ کوئی بات پیش آئے تو عتاب ومحاسبہ کا سلسلہ زیادہ نہ کیا جائے۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں ایک باب رکھا ہے (باب من لم یواجه الناس بالعتاب) (لوگوں سے رودررو عتاب کی بات نہ کرنا) اور اس میں حضرت عائشہؓ کی حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی کام کیا اور اس میں رخصت ووسعت رکھی، کچھ لوگوں نے پھر بھی اس کو نہ کیا، آپ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے صحابہ سے خطاب فرمایا اور خطاب میں اللہ تعالی کی حمد وثنا کے بعد فرمایا:

"کچھ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ جس چیز کو میں کرتا ہوں وہ اس سے بھی احتراز کرتے ہیں، بخدا میں اللہ کو ان سے کہیں زیادہ جانتا ہوں اور ان کے مقابلہ میں اس سے کہیں زیادہ ڈرتا ہوں" (بخاری: ۶۱۱۰، مسلم: ۲۳۵۶ واللفظ للبخاری)۔

اسی قبیل کی وہ حدیث ہے جس میں آیا ہے کہ ایک آدمی کے آنے پر آپ نے فرمایا: اس کو بلالو، بڑا خراب آدمی ہے اور جب وہ اندر آیا تو اس کو قریب کیا اور اپنے گدے پر اس کو بٹھایا اور جب حضرت عائشہؓ نے اشکال کیا کہ آپ نے تو یہ فرمایا تھا پھر یہ معاملہ؟ تو اپنے سلوک کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"إن من شر الناس من تركه الناس أو ودعه الناس اتقاء فحشه"

(بخاری: ۶۰۵۴، واللفظ لہ، مسلم: ۲۵۹۱ عن عائشہؓ)۔

(وہ آدمی بروں میں سے ہے جس کو لوگ اس کی بدکلامی وسخت کلامی کی وجہ سے چھوڑ دیں)۔

تالیف قلب اور عداوت کی دوری کا کام اس سے بھی ہوتا ہے کہ آدمی اپنے لئے اور اپنے نفس کے لئے انتقام نہ لے اور نہ تشفی نفس کے لئے کوئی کام کرے۔

۴۔ عدم تعصب:

کسی قسم کا تعصب نہیں ہونا چاہئے، نہ مذہب کا، نہ مشرب کا، نہ شیخ کا، نہ جماعت کا، نہ تحریک وپارٹی کا، ایسے ہی تعصب کے حق میں کہا گیا ہے:

"حبك الشيء يعمي ويصم" (احمد ۵/ ۱۹۴، ابوداؤد: ۵۱۳۰ مرفوعا، لیکن مرفوعا صحیح نہیں ہے، ملاحظہ ہو: کشف الخفاء ۲/ ۷۹، سلسلۃ الضعیفہ: ۱۸۶۸، ۴۳۴۷) (محبت آدمی کو اندھا وبہرا بنادیتی ہے)۔

تعصب سے کام لینے والا اندھا ہوتا ہے، اس کو نشیب وفراز کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا، اور وہ حق وباطل میں امتیاز نہیں کرپاتا حتی کہ تعصب سے کام لینے والا اپنے جوش وشدت کی بناپر خود کو محب سے مبغض (نفرت کرنے والے) میں بدل دیتا ہے۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ کا ارشاد ہے، جس کو مرفوعا بھی نقل کیا جاتا ہے لیکن موقوف

صحیح ہے:

"احبب حبیبک ھو ناما عسی أن یکون بغیضک یوما ما وابغض بغیضک ھو ناما عسی أن یکون حبیبک یوماما" (ابن ابی شیبہ:۳۵۸۷۹، بخاری فی الادب المفرد:۱۳۲۱، بیہقی فی شعب الایمان:۶۵۹۳ موقوفا، نیز ترمذی:۱۹۹۷، طبرانی فی الاوسط:۳۳۹۵، قضاعی فی مسند الشہاب:۹۳۷ مرفوعا، ملاحظہ ہو: علل دارقطنی ۸/۱۱۰، العلل المتناہیۃ لابن الجوزی ۲/۷۳۵)۔

(اپنے دوست ومحبوب سے ایک مناسب حد میں محبت کرو کہ ہوسکتا ہے کہ وہ کبھی تمہارا دشمن بن جائے اور اپنے دشمن سے نفرت ایک حد میں کرو، ہوسکتا ہے کہ وہ کسی دن تمہارا دوست بن جائے)۔

محمد بن یحییٰ ذہلی نیشاپوری کے متعلق آتا ہے کہ امام احمدؒ کا جب بغداد میں انتقال ہوا تو ان کو بڑا رنج ہوا اور اس پر انہوں نے کہا: بغداد کے ہر خاندان کو چاہئے کہ ان کے لئے اپنے گھروں ومحلوں میں مجلس نوحہ منعقد کریں۔

اس پر امام ذہبیؒ فرماتے ہیں:

"ذہلی نے یہ بات (شدت) رنج وغم کے تحت کہی ہے، شریعت کے تقاضے سے نہیں"

(ملاحظہ ہو: سیر اعلام النبلاء ۱۱/۲۰۳، ۲۰۴)۔

اس لئے کہ شرعاً نوحہ ممنوع ہے۔

خراسان کے بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ امام احمدؒ فرشتوں سے تعلق رکھتے ہیں، انسانوں میں سے نہیں ہیں (ملاحظہ ہو: سیر اعلام النبلاء ۱۱/۲۱۱)۔

کسی کا یہ بھی قول ہے: ہمارے نزدیک امام احمدؒ کی ایک نظر ساٹھ سال کی عبادت کے برابر ہے۔

ذہبی نے کہا: یہ غلو ہے جو درست نہیں ہے (ملاحظہ ہو: سیر اعلام النبلاء ۱۱/۲۱۱)۔

امام احمدؒ کا واقعہ یہ ہے کہ ایک متواضع اور تکلف سے دور شخص تھے، لیکن اس قسم کی باتیں

مختلف اسباب ودواعی کے تحت کہی جاتی ہیں، کبھی رنج کی بنا پر، اور کبھی مصیبت پر خوش ہونے والے کی خوشی وحال کو رد کرنے کے جذبہ سے، لیکن یہ اور اس قسم کی باتیں بہر حال غلط وقابل رد ہیں، ان سے صرف نظر اور ان پر انکار ہی مناسب ہے، جیسا کہ ذہبی وغیرہ نے کیا ہے۔

محمد بن مصعب سے منقول ہے: امام احمدؒ کو جو کوڑے، اللہ کی نسبت سے لگے وہ بشر بن حارث کے حالات وواقعات سے بڑھ کر ہیں۔

امام ذہبیؒ نے اس پر فرمایا: بشر امام احمدؒ ہی کی طرح ایک جلیل القدر آدمی ہیں اور اعمال کا معاملہ تو اللہ ہی جانتا ہے (ملاحظہ ہو: سیر اعلام النبلاء ۲۰۱/۱۱)۔

مجھے انٹرنیٹ کا ایک کاغذ اس مضمون کا ملا:

"ابن باز ہی جماعت (یعنی اہل سنت والجماعت) ہیں ورنہ البانی"۔

ابن بازؒ ائمہ مسلمین میں سے تھے، اور صاحب علم، باہدایت اور صاحب بصیرت بھی تھے، اور مجھے یاد آتا ہے کہ ایک دن میں نے ان کو کہتے سنا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ انشاء اللہ اپنی بات میں سچے ہیں اگر چہ ہم اللہ کے مقابلے میں کسی کی پاکیزگی کو بیان نہیں کر سکتے:

"والله منذ عقلت إلى اليوم لا أعلم أني كتبت كتابا إلا وأنا أحسبه عند الله عز وجل" (بخدا جب سے میں نے ہوش سنبھالا تب سے آج تک جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے جو بھی تحریر لکھی، اللہ عزوجل کے نزدیک اس پر اچھی ہی امید رکھی)۔

یہ اخلاص اور بے غرضی کا ایسا درجہ ہے کہ جس کی نظیر کم ملے گی، لیکن یہ بھی غلط ہے کہ پوری امت کو ایک آدمی میں منحصر کر لیا جائے، نہ ابن باز میں اور نہ کسی دوسرے میں، اللہ نے اس امت میں بڑی خیر رکھی ہے، اور اس امت کو طرح طرح کی اہلیتوں وصلاحیتوں اور علوم سے نوازا ہے، جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

اور یہ سمجھنا ومانناکہ ایک آدمی ہی جماعت ہے اور لوگوں پر اس کی اتباع اور اس سے

استفادہ لازم ہے، یہ رائے دوسرے لوگوں سے قطع نظر خود ان ائمہ کے نقطہ نظر سے غلط ہے، مطلق طاعت تو صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہے، اور حق کسی ایک شخص یا امام میں منحصر نہیں ہے۔

شیخ ابن بازؒ جب سعودیہ کے مفتی تھے تو اپنی رائے کو لوگوں کے لئے لازم نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کا قول دوسرے علماء کے قول کی طرح ہے، جس کو دلیل کی بنا پر اختیار کیا جائے گا، اور دلیل کی بنیاد پر اس کو رد بھی کیا جاسکتا ہے، لہذا شیخ خود اپنے لئے جو مقام مانتے رہے لوگوں سے اس سے زیادہ کا مطالبہ نہ کرو بلکہ ان سے وفاداری یہ ہے کہ ان کے حق میں اس ادب کا التزام کرو۔

باقی تعصب کا عجیب معاملہ ہے کہ وہ کبھی کبھی ایسے آداب کی ضد کی طرف لے جاتا ہے اور وہ ان لوگوں کی تحقیر و تنقیص تک پہنچا دیتا ہے جو آدمی کی عصبیت میں اس کا ساتھ نہیں دیتے۔

بعض فقہاء کوفہ کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے حج کا سفر کیا تو حجاز - مکہ و مدینہ - میں وہاں کے علماء عطاء بن ابی رباح، طاؤس بن کیسان، مجاہد بن جبر، وغیرہ سے ملاقات کی اور واپسی میں کوفہ جا کر کہا:

”اے اہل کوفہ خوشخبری سنو خوشخبری، میں اہل حجاز کے پاس گیا، اور عطاء وطاؤس ومجاہد کو دیکھا (اور ان سے ملا) تمہارے بچے بلکہ بچوں کے بچے بھی فقاہت میں ان سے فائق ہیں

(ملاحظہ ہو: سیر اعلام النبلاء ۵/ ۲۳۵)۔

بعض لوگوں نے اپنے ذہن کے مطابق ابن جوزی کے معائب وخطاؤں کو شمار کرتے ہوئے کہا: ”میں نے تو کسی ایسے آدمی کو جس کے دین اور علم و عقل پر اعتبار و اعتماد کیا جاتا ہو ابن الجوزی سے راضی نہیں دیکھا“۔

ذہبیؒ نے اس پر فرمایا: اگر اللہ ان سے راضی ہے تو ان لوگوں کا کیا اعتبار (اور ان کی رضا کی کیا ضرورت) (ملاحظہ ہو: سیر اعلام النبلاء ۲۱/ ۳۸۳)۔

اس کہنے والے نے ابن جوزی کو اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھا اور وہ خود ان سے خوش نہیں تو اس نے دوسروں کی رائے و نظر وہی بتائی جو اس کی اپنی تھی۔

جیسے کہ بہت سے لوگ بکثرت اس قسم کی باتیں کہتے ہیں، فلاں پر دل مطمئن نہیں، فلاں سے قلب کو وحشت ہوتی ہے، وغیرہ اور ظاہر ہے کہ وہ اپنے احساس کو عام قرار دیتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کو فلاں وفلاں کی حیثیت کم کرنے و بتانے کی گفتگو کے سیاق میں تم بکثرت اس قسم کے جملے سنو گے (جو اسی قبیل کے ہیں) فلاں ہمارے مذہب یا ہمارے طریقہ پر نہیں ہے، یا ہماری جماعت کا آدمی نہیں ہے، یا فلاں کے پاس علم نہیں ہے، یا فلاں کچھ نہیں ہے۔

ابو نعیم کے متعلق آتا ہے کہ انہیں کسی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ حدیث کا درس دیتا ہے تو کہا: اس کا حدیث سے کیا واسطہ، ہاں تورات کا علم اس کو ہے (ملاحظہ ہو: سیر اعلام النبلاء ۱۰/ ۴۴۴)۔

ابو نعیم کو اللہ معاف فرمائے بڑے مقام و مرتبہ کے آدمی ہیں لیکن آدمی کبھی غضب اور کبھی رضا کے حال میں بات کرتا ہے، کبھی مسلمان تورات پڑھتا ہے اور اس لئے کہ اس کے حق و باطل، منسوخ، صحیح و محرف کو جان سکے تا کہ اہل کتاب کا رد کرے، اور یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کو سنت کے پڑھنے پڑھانے سے روک دیا جائے یا یہ کہا جائے کہ وہ تورات زیادہ جانتا ہے جبکہ مقصد اس کی بے وقعتی اور تحقیر و تنقیص ہو۔

(۵)

اختلاف کونباہنے کے قواعد وآداب

اختلاف کو کس طرح برتا جائے اور نباہا جائے، اس کے کچھ اصول وضوابط ہیں، اور یہ مستقل ایک علم ہے جو آج پڑھا پڑھایا جاتا ہے اور کتب خانوں کی لائبریریاں اس فن کی کتابوں سے بھری ہوئی ہیں، جو طرح طرح کی ہیں، قلمی ومطبوعہ، اصل وترجمہ، جدید وقدیم، اس سلسلے کے چند بنیادی مسائل واصول پیش خدمت ہیں:

(۱) کتاب وسنت کا اعتصام۔التزام واہتمام:

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وما اختلفتم فيه من شيئ فحكمه إلى الله ذلكم الله ربي عليه توكلت وإليه أنيب" (الشوری:۱۰) (اور جس جس بات میں تم اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے یہ اللہ میرا رب ہے، میں اسی پر توکل کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں)۔

نیز یہ بھی ارشاد ہے:

"فإن تنازعتم في شيئ فردوه إلى الله والرسول إن كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر" (النساء:۵۹) (پھر اگر کسی چیز میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کے حوالے کردیا کرو، اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو)۔

الف- قرآن کریم: حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

"إن هذا القرآن يهدى للتى هى أقوم" (الاسراء:۹) (بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے)۔

ب- سنت نبویہ: حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"لقد كان لكم فى رسول الله أسوة حسنة لمن كان يرجو الله واليوم الآخر وذكر الله كثيراً" (الاحزاب:۲۱) (تم لوگوں کے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے جو اللہ سے اور روز آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ ہے)۔

(۲) مذاکرہ (باہمی گفتگو):

مذاکرہ اور باہمی گفتگو کی نوبت انہیں لوگوں کے درمیان آتی ہے جن میں آپس میں اختلاف ہو، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اچھے طریقہ وانداز سے بحث ومباحثہ کا حکم دیا ہے حتی کہ اہل کتاب کے ساتھ بھی اس کا حکم ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ولا تجادلوا أهل الكتاب إلا بالتى هى أحسن إلا الذين ظلموا منهم" (العنکبوت:۴۶) (اور تم اہل کتاب سے بجز مہذب طریقے کے مباحثہ مت کرو، ہاں جو ان میں زیادتی کریں)۔

حتی کہ جو لوگ اصول میں مخالفت رکھتے ہوں تو اہلیت رکھنے والوں کو ان سے بھی اچھے انداز میں مذاکرہ وگفتگو کرنا چاہئے، حق تعالیٰ نے ابلیس سے جو کچھ فرمایا تھا اس کا تذکرہ ہمارے لئے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے:

"قال يا إبليس ما منعك أن تسجد لما خلقت بيدى، استكبرت أم كنت من العالين قال أنا خير منه خلقتنى من نار وخلقته من طين" (ص:۷۵،۷۶)۔

(حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابلیس جس چیز کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اس کو سجدہ کرنے سے

تجھ کو کون چیز مانع ہوئی، تو غرور میں آ گیا یا یہ کہ تو (واقع میں) بڑے درجہ والوں میں ہیں؟ کہنے لگا کہ میں آدم سے بہتر ہوں کہ آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو خاک سے پیدا کیا ہے)۔

اسی طرح حق تعالی نے حضرت آدم کی پیدائش کی مناسبت سے فرشتوں سے جو فرمایا تھا، اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔

اس لئے مختلف سطح پر مذاکرات ہونے چاہئیں۔

- اسلامی جماعتوں وتنظیموں کے درمیان
- حکومتوں کے درمیان
- مختلف جماعتوں وگروہوں کے درمیان

اور لوگوں کو آزادی سے اپنی آراء وافکار کو بیان کرنے کا موقع دینا چاہئے، اس لئے کہ اس صورت میں غلط ومنحرف افکار وآراء خود اپنی موت مرجاتے ہیں اور جو چیز صحیح ہوتی ہے وہی باقی رہتی ہے۔

باہمی مذاکرات سے ان لوگوں کو قابو میں کیا جاسکتا ہے جو توحش وکشاکش کا شکار ہوتے ہیں اور ان کو ایک پرامن و پرسکون معاشرہ کا جزء وحصہ بنایا جاسکتا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظاً غليظ القلب لانفضوا من حولك" (آل عمران:۱۵۹) (خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تندخو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہوجاتے)۔

پرسکون علمی مناظرہ، حق تک پہنچنے کے ذرائع میں سے ہے اور اختلاف ونزاع کرنے والوں کے درمیان قربت پیدا کرنے کا وسیلہ ہے، جہاں تک سوال ہے ٹی وی چینلوں پر آنے

والے مناظرہ ومذاکرات کا، خواہ وہ کسی موضوع پر ہوں، سیاسی معاملہ ہو یا اعتقادی، یا فکری ونظریاتی، تو ان مناظرات کا معاملہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض میں تو سکون، تحمل، نیز واقعیت واعتدال کا لحاظ ہوتا ہے، اس قسم کے مناظرے اچھے ہوتے ہیں جو عوام کو بات کے سننے پر آمادہ کرتے ہیں اور زیر بحث مسئلہ میں غور وفکر اور دوسری رائے کے قبول کرنے پر تیار کرتے ہیں۔

لیکن بہت سے مناظرات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کا مقصد صرف عوام کو جمع کرنا واکٹھا کرنا ہوتا ہے، اور ان میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت سی مغالطہ انگیزیاں اور حقیقت سے آگے بڑھ کر باتیں ہوتی ہیں اور گفتگو ومذاکرہ کے لئے نقاط بھی محدود ومتعین نہیں ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں وقت بھی بہت لگتا ہے اور ان کی جدوجہد کا بڑا حصہ ضائع وبیکار جاتا ہے، اور اس سے یہ خرابی مزید ہوتی ہے کہ لوگوں میں ضد، عناد، تعصب اور آپسی نفرت میں اضافہ ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ پھر یہ مناظرے نہ تو اختلاف کرنے والوں کو قریب کرتے ہیں اور نہ ان سے کسی باطل کی وضاحت ہوتی ہے اور نہ حق ہی منکشف ہوتا ہے اور بسا اوقات اس کا زیادہ سے زیادہ حاصل یہ ہوتا ہے کہ یہ مناظرے ایک قسم کا اعلامیہ ہوتے ہیں جبکہ ان کو بھی بڑا مرتب ومنضبط ہونا چاہئے اور ان میں سکون واعتدال ومیانہ روی کو بھی اختیار کرنا چاہئے۔

(۳) شوریٰ:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بھی اس کا حکم دیا ہے، ارشاد ہے:

"فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم فى الأمر" (آل عمران:۱۵۹) (سو آپ ان کو معاف کردیجئے اور آپ ان کے لئے استغفار کردیجئے اور ان سے (خاص خاص) باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے)۔

نیز ارشاد ہے: "وأمرهم شورى بينهم" (شوریٰ:۳۸) (اور ان کا ہر کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے)۔

حضور ﷺ نے بھی اپنے صحابہ سے بدر، احد، خندق وغیرہ جیسے مواقع میں مشورہ فرمایا۔

شورائی نظام کی پختگی آج ان ضرورتوں میں سے ہے جن سے مفر نہیں ہے خواہ گھریلو وخاندانی معاملہ ہو، یا تعلیمی اداروں وحکومت کا، اور لوگوں کے دیگر معاملات خواہ ان کا تعلق ان کے حال سے ہو یا مستقبل سے، اور خاص طور سے جوانوں کے معاملات میں اس کو اختیار کیا جانا چاہئے۔

کیونکہ آج اس کی بہت ضرورت ہے کہ ان کو قریب کیا جائے اور ان سے قریب ہوا جائے، اور ان کے دکھ و درد کو محسوس کیا جائے، ان کی مشکلات و پریشانیوں کو سنا جائے، نیز یہ کہ ہم ان کو اپنی ہی رائے و عقل پر مجبور نہ کریں، اور نہ ہی ہم ان کو حقیر و معمولی سمجھیں، ان کو ان کی اہمیت کا احساس دلانا بہت بڑی ضرورت ہے، اور ان کو سننا ایک قطعی فرض ہے، نیز ان کو حق کا سنانا بھی واجب و ضروری ہے، اس طور پر کہ حق کی بات بالکل صاف واضح و خالص ہو اور اس میں کسی طرح کا ہیر و پھیر نیز لیپا پوتی نہ ہو۔

(۴) متفق علیہ کے دائرہ کو کارآمد و مؤثر بنانا:

بعض لوگ رشید رضا کا معروف قاعدہ "قاعدة المنار" پڑھتے ہیں جس میں انہوں نے کہا ہے:

"جس چیز میں ہم متفق ہیں اس کے بارے میں ہم ایک دوسرے کے معاون ہیں اور جس میں باہم ہمارا اختلاف ہے اس میں ہم ایک دوسرے کو معذور سمجھتے ہیں"۔

اس قاعدہ کو پڑھنے والے بعض لوگ یوں کہتے ہیں:

"اتفاقی چیزوں میں ہم ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں اور اختلافی چیزوں میں ہم ایک دوسرے کے سر توڑ ڈالتے ہیں"۔

ہم اس وقت ان لوگوں سے متعلق کوئی گفتگو نہیں کر رہے ہیں جو اصول اور قواعد شریعت

میں ہمارے مخالف ہیں، بلکہ ان لوگوں سے متعلق ہماری گفتگو ہے جو قرآن وسنت کے اتباع واتباع کے دائرہ میں ہیں دوسروں کی تو بات ہی نہیں ہے۔

ابن تیمیہؒ نے متعدد مواقع میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کفار اگر بعض اہل بدعت جہمیہ وغیرہ میں سے کسی کے ہاتھوں پر اسلام لائیں تو کفر پر ان کے باقی رہنے سے بہتر ہے، اور فاسق وفاجر لوگوں کی توبہ اگر کسی ضعیف حدیث کی بنا پر بھی ہو تو بھی ان کے فسق وفجور پر باقی رہنے سے بہتر ہے، اور کسی مبتدع کے پیچھے نماز، ترک جماعت سے بہر حال بہتر ہے (ملاحظہ ہو: مجموع الفتاوی ۱۳/۹۶، ۲۳/ ۳۵۳-۳۵۴)۔

متفق علیہ امور کے دائرہ کار کو مؤثر وبا کار بنانے کا مسئلہ مصلحت واجتہاد، غور وفکر نیز تغیر احوال سے تعلق رکھتا ہے۔

اور آج کے مسلمان تو اس کے بہت محتاج ہیں اور ان کو یہ بہت سزاوار ہے کہ وہ اس چیز کی طرف توجہ دیں، جبکہ صورت یہ ہے کہ مسلمان کمزوری کا شکار ہیں، ان کے دشمن ان پر مسلط ہیں، مسلمانوں کو اس بات کے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ متفق علیہ باتوں کی شرعی حقائق میں بڑی اہمیت ہے، اور دنیوی مصالح میں اس کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور اس کو بھی کہ اللہ تعالی نے بر وتقوی پر تعاون کو ہمارے لئے مشروع کیا ہے، خواہ کسی کے ساتھ ہو، بس دائرہ نیکی وتقوی کا ہونا چاہئے، اور ہم کو گناہ نیز ظلم وزیادتی پر تعاون سے منع کیا ہے، خواہ کسی کی تائید میں ہو، شریعت نے تعاون کے موضوع کو محدود ومتعین کیا ہے، جہت وآدمی کو متعین نہیں کیا ہے۔

اور حق تعالی کے اس ارشاد: "أن تبروھم" (احسان وسلوک کا برتاؤ کرو) اور اس کو "لتعارفوا" (تاکہ باہم تعارف ہو) جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ مراد ہے تاکہ تم لوگ آپس میں اچھا اور اچھائی کا معاملہ کرو۔

ان دونوں کو ملاؤ تو خیر ومصلحت پر تعاون کی مشروعیت سامنے آتی ہے اور ہر ایک کے

ساتھ قریبی ہو یا دور کا، اور یہ کہ گناہ وزیادتی سے دور رہا جائے چاہے اس قسم کی چیزیں بہت قریبی اور نہایت محبوب آدمی کی طرف سے پیش آئیں۔

اور اللہ سبحانہ فرماتے ہیں:

"والأرض وضعها للأنام" (الرحمٰن:۱۰) (اور اللہ نے زمین کو خلقت کے لئے بنایا)۔

یعنی زمین کو سارے انسانوں کے لئے اس نے بنایا ہے، اس لئے نہیں کہ سب اس پر جنگ کریں، بلکہ اس لئے کہ مل کر رہیں، ایک دوسرے کو سمجھیں بوجھیں، اور آپس میں عدل وانصاف کا معاملہ کریں۔

اور جب یہ حکم اس کے ساتھ ہے جو مخالف اصلی ہو، تو جو ملت و مذہب یا تنظیم و تحریک کی رو سے مخالف ہو اس کے ساتھ یہ حکم کیوں نہ ہوگا۔

(۵) اجتہاد کی ہمت افزائی اور عقل کی کارکردگی وترقی نیز فعالیت کے لئے مناسب ماحول کی فراہمی:

شرعی آزادی کی فضا ہی وہ ماحول وموقع ہے کہ جس میں صحیح افکار کو ترقی ورونق حاصل ہوتی ہے، اور جب صورت وماحول یہ ہو کہ اپنی رائے کے اظہار سے پہلے آدمی کو ہزاروں حساب لگانا پڑے تو ایجاد کی موت ہو جاتی ہے، حساب اس کا اور اس وجہ سے کہ جو کہنا چاہتا ہے اس کے کہنے پر تہمتوں، طعن وتشنیع، نیز ایذارسانی وغیرہ کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہم ابتداع (بدعات) کی بات نہیں کر رہے ہیں بلکہ ابداع (ضرورت کے مطابق نیا کام کرنے) کی بات کر رہے ہیں دونوں میں فرق ہے، ابداع دنیا کے معاملہ میں اور جس چیز سے شریعت میں سکوت ہو یا جس میں اختلاف ہو دونوں کے حق میں ہوتا ہے۔

اور ابتداع دین میں اور خالص منصوص چیز میں ہوتا ہے، حضرت ابن عباسؓ کا قصہ

ہمارے لئے نامانوس نہیں ہے، ان کا بیان ہے:

”حضرت عمرؓ بدر کے مشائخ کے ساتھ مجھ کو اپنے پاس بٹھاتے تھے، اس پر بعض حضرات نے کہا کہ اس نوعمر لڑکے کو ہمارے ساتھ آپ کیوں بٹھاتے ہیں، آخر ہمارے بھی ان کے جیسے بیٹے ہیں؟ فرمایا کہ یہ کیا ہیں آپ لوگ جانتے ہیں، ایک دن حضرت عمرؓ نے ان کو بلایا اور ان کے ساتھ مجھ کو بھی بلایا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس دن انہوں نے مجھ کو محض اسی غرض سے بلایا کہ ان کو میری طرف سے (کچھ صلاحیت ولیاقت) دکھادیں۔

چنانچہ فرمایا کہ آپ لوگ اس آیت کے متعلق کیا فرماتے ہیں:

"إذا جاء نصر الله والفتح ورأيت الناس يدخلون في دين الله أفواجاً فسبح بحمد ربك واستغفره إنه كان توابا" (سورہ نصر)۔

(جب خدا کی مدد اور مکہ کی فتح آ پہنچے کہ آپ لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوتا ہوا دیکھیں تو اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیجئے اور اس سے استغفار کی درخواست کیجئے وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے)۔

بعض نے کہا کہ اللہ تعالی نے ہم کو یہ حکم فرمایا ہے کہ جب دشمن کے مقابلہ میں ہماری نصرت وفتح سامنے آئے تو اس کی حمد وثنا کریں اور استغفار کریں، بعض نے کہا ہم کو کچھ معلوم نہیں اور بعض کچھ نہ بولے، پھر مجھ سے فرمایا: اے ابن عباس تم بھی یہی کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں، فرمایا: پھر تم کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا یہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کا ذکر ہے، اللہ نے آپ کو اس کی خبر دی ہے: "إذا جاء نصر الله والفتح" (جب اللہ کی مدد اور فتح آ پہنچے) فتح مکہ مراد ہے اور یہ آپ کی موت کی علامت ہے، فسبح بحمد ربك واستغفره إنه كان توابا" (تو اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیجئے کہ وہ بہت معاف کرنے والا ہے)۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں بھی وہی سمجھتا ہوں جو تم سمجھتے ہو“ (بخاری: ۴۲۹۴)۔

انسانوں میں سب سے زیادہ حریت کے حاجتمند اسلام کے ماننے والے ہیں اوران پر لازم ہے کہ وہ ظلم وستم کے خلاف برسر پیکار ہوں اور وہ اپنے دشمنوں ومخالفین کے ساتھ بھی اس کی اجازت نہ دیں جب تک کہ ان کا معاملہ یہ ہو کہ ان کی طرف سے کھلے طور پر گناہ کا مظاہرہ نہ ہو۔

(٦) تعمیری نقد کی ہمت افزائی نیز حالات کا پرسکون وسنجیدہ جائزہ:

خواہ سیاسی صورت حال ہو جس کا تعلق حکومت سے ہو، یا معاشرتی ہو، جو لوگوں کی موروثی چیز سے متعلق ہوتی ہے، یا دعوتی ہو جو داعیوں کے نظام اوران کے طریقہ کار اور اسلوب وانداز سے مرتبط ہو۔

ان سارے احوال، شکلوں وطریقوں، کو سکون، یکسوئی، اور آہستگی کے ساتھ دیکھنا اور سمجھنا، زندگی کی ایک شرعی ضرورت ہے۔

ہم جس حال میں ہیں وہ کسی اعتبار وجہت سے سب سے اچھی صورت حال نہیں ہے کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ ہم جس حال میں ہیں وہ کافی وشافی ہے، اس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہم سب کو یہ اعتراف ہے-اور کرنا چاہئے-کہ ہمارے حالات، درستگی کے محتاج ہیں اور درستگی کی طرف پہلا قدم وہ علمی نقد ہے جو بامقصد وتعمیری ہو۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ طاقت وڈکٹیٹرشپ لوگوں کو ایک ومتحد کرسکتی ہے، خواہ سیاسی ڈکٹیٹرشپ ہو کہ جس میں عوام کی رائے دبادی جاتی ہے، یا علمی ہو کہ ایک مذہب کی رائے دوسروں پر مسلط کی جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ڈکٹیٹرشپ سب کو ایک نہیں کرسکتی بلکہ یہ چیز تو ایسی ہے کہ بسا اوقات آدمی کے ساتھ اس وقت دھوکہ وخیانت کرتی ہے، اور کام نہیں آتی، جبکہ آدمی کو اس کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

کیونکہ حالات بدلتے رہتے ہیں اور لوگ چاہیں یا نہ چاہیں، انقلاب وردوبدل کی فضا

بنتی ہے، اور حصول آزادی کی ہوائیں چلنا شروع ہوتی ہیں تو طرح طرح کے سیاسی واجتماعی اور ثقافتی نعرے و آوازے بلند ہوتے ہیں اور مختلف سطح پر اٹھا پٹخ سامنے آتی ہے۔

(۷) امر بالمعروف ونہی عن المنکر :

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اہل ایمان کا امتیاز وشناخت ہے، اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

"**والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر**" (التوبہ:۷۱) (اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں)۔

اس لئے اس کا سلسلہ اہل علم وطلبہ علم اور داعیان دین، نیز عوام وخواص سب کے درمیان رہنا چاہئے اور اس طرح کہ اس میں علم وحکمت اور نرمی وصبر سے کام لیا جائے، نیز اس کو محض اللہ کے لئے اور اسی سے اجر وثواب کی امید نیز جو کمال اللہ کی طرف سے فرد وجماعت کے لئے مقدر ہے اس کے حصول کی آرزو وحرص رکھتے ہوئے اس کو کیا جائے، اس کے پیچھے زمین میں اپنی سربلندی اور اس بہانے شر وفساد کو نہ سوچا جائے۔

اس مناسبت سے کچھ نقاط قابل توجہ ہیں جن کا اس کام میں لحاظ کیا جانا بہت بہتر ہوگا۔

الف- اجتہادی مسائل جس میں علماء کا اختلاف ہے، ان میں انکار نہیں :

ایسے مسائل میں ایک دوسرے پر انکار نہیں کیا جاتا اور نہ کرنا چاہئے، اس لئے کہ سب مجتہد ہیں اور اگرچہ مصیب (صحیح بات تک پہنچنے والا) مجتہد ایک ہی ہوتا ہے مگر محروم اور اجر سے خالی کوئی مجتہد نہیں رہتا، بعض علماء نے اس کا تذکرہ کیا ہے کہ اجتہادی مسائل اور ہیں، نیز اختلافی اور۔

ب- بہت سے اختلافی مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں قول راجح یا اس کی دلیل واضح ہوتی ہے، ایسے مسائل میں بہت اچھے انداز میں تعلیم ورہنمائی کا کام کرنا چاہئے، موقع ومحل کا لحاظ کرتے ہوئے زبان وبیان نیز اسلوب وانداز کو اختیار کرنا چاہئے۔

ج- کسی مقلد کا دوسرے مقلد پر انکار کرنا:

اگر کوئی انسان غیر کا مقلد ہو، کسی عالم کا یا مذہب کا تو اس کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے کسی مقلد پر انکار کرے۔

د- انکار نہ کرنے کا مطلب نصیحت نہ کرنا نہیں ہے:

انکار نہ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ایک آدمی دوسرے کو حسب موقع نصیحت نہ کرے، یا اس کی خیر خواہی میں کچھ نہ کہے، نصیحت خالص علمی مسائل میں نہیں ہوتی، چنانچہ امام شافعیؒ اپنی کتاب ''الام'' وغیرہ میں فرماتے ہیں کہ جو آدمی کسی علمی وفقہی مسئلہ میں مجھ سے اختلاف رکھتا ہے میں اس سے یہ نہیں کہتا کہ وہ اللہ سے توبہ کرے کیونکہ توبہ گناہوں سے ہوتی ہے، اور ایسا آدمی (گنہگار نہیں ہوتا بلکہ) ایک اجر یا دو اجر کا حقدار ہوتا ہے۔

اور امام شافعیؒ وغیرہ نے اس سیاق میں جن مثالوں اور مسائل کا تذکرہ کیا ہے ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اختلاف کا میدان ان حضرات کے نزدیک کتنا وسیع تھا اور وہ کس طرح مختلف نظریات وافکار کا احاطہ واستیعاب رکھتے تھے۔

ہ- منکر پر انکار میں فقہ المصالح کا لحاظ:

منکر پر انکار میں مصالح کا لحاظ ہونا چاہئے، اس لئے کہ اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ انکار کا مدار اس پر ہے کہ مصلحت بروئے کار لائی جائے اور مفسدہ کا دفعیہ کیا جائے، اسی لئے

حالات کے مطابق، پانچوں احکام کا اس میں اجراء ہوتا ہے۔

و-انکار میں تدریج وآہستگی کا لحاظ:

منکر پر انکار میں اس کا بھی لحاظ مطلوب ہے کہ بات دھیرے دھیرے بتدریج وبترتیب سامنے لائی جائے، کیونکہ لوگ جن چیزوں کے عادی ہوں ان کو ایسی چیزوں سے ایک دم سے ہٹانا ودور کرنا یہ شاق وگراں ہوتا ہے پھر یہ کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اگر نفع ومصلحت سے خالی ہو تو آدمی پر یہ کام لازم بھی نہیں جیسا کہ عز بن عبدالسلام، ابن تیمیہ اور ابن القیم نے ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو: قواعد الاحکام ۱ر ۹۴، ۱۰۸، مجموع الفتاوی ۱۴ر ۴۷۲، ۴۷۳، اعلام الموقعین ۳ر ۴)۔

ز-ایک دوسرے سے دوری وعلاحدگی:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وإن كان طائفة منكم آمنوا بالذی أرسلت به وطائفة لم يؤمنوا فاصبروا حتى يحكم الله بيننا" (الاعراف: ۸۷) (اور اگر تم سے بعض اس حکم پر جس کو دے کر مجھ کو بھیجا گیا ہے، ایمان لاتے ہیں اور بعضے ایمان نہیں لاتے ہیں تو ذرا ٹھہر جاؤ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ کردیں)۔

سیرت وفقہ میں بہت سے ابواب ہیں جن کا استعمال کیا جانا چاہئے، کیونکہ کچھ ابواب آپسی معاہدے وصلح کے ہیں، کچھ ایک دوسرے سے دوری وقطع تعلق کے ہیں، اور کچھ مجاہدے وسخت روی کے ہیں، اس لئے انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ خوب غور وفکر کرے کہ موقع ومحل کے کیا مناسب ہے، کیونکہ بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ انسان اس کا محتاج وضرورت مند ہوتا ہے کہ آپس میں سکون کے ساتھ رہے، اس طرح کہ آپس میں کوئی جنگ وجدال نہ ہو اور کچھ صلح ومعاہدے کا معاملہ بھی ہو اور کچھ ایک دوسرے سے دوری اور علاحدگی بھی ہو۔

(۸) واضح وصاف گفتگو کرنا اور اختلاف کو بے وقعت وکم حیثیت نہ بنانا:

بعض لوگ جذباتیت کے نتیجہ میں اس قسم کی سعی کرتے ہیں کہ گفتگو میں اختلاف کے حدود سے تجاوز کریں یا اس کو اہمیت نہ دیں جبکہ اختلاف واقعیت وقوت رکھتا ہے، یہ رخ صحیح نہیں ہے، یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی مریض اسپتال کو جائے اور نوعیت یہ ہو کہ مرض کی وجہ سے اس کا جسم پھٹا جارہا ہو لیکن اسپتال میں اس کے سامنے اس کے مرض اور مرض کے جائزہ سے متعلق بہت سجاو سنوار کر بات کی جائے اور یہ ثابت وباور کرایا جائے کہ وہ بالکل صحت منداور ٹھیک وٹھاک ہے۔

واضح وصاف گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان پائے جانے والے اختلافات سے متعلق ہم دوٹوک باتیں کریں مگر اس طرح کہ حدود سے تجاوز نہ ہو اور اس گفتگو سے اختلافات کے سلبی پہلوؤں کا خاتمہ ہو جائے، اور یہ اس انداز پر ہو کہ ہم یہ نہ سمجھیں کہ ہم حق کی مرجعیت کی نمائندگی کررہے ہیں، اور ہم ہی قطعی طور سے حق پر ہیں، بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ انداز ہو کہ ہم دوسروں سے اپنی طرف آنے کا مطالبہ کررہے ہیں۔

(۹) فہم صحیح نیز باہمی ربط کے حدود کا خیال:

بہت سے اختلافات اس وجہ سے وجود میں آتے یا بڑھتے ہیں کہ ان کا کسی خاص غرض کے تحت پروپیگنڈا کیا جاتا ہے، یا ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے حق میں کوئی بات پوری تحقیق واطمینان کے بغیر کہی جاتی ونقل کی جاتی ہے، یا کوئی بڑا تاثر اس کے پیچھے ہوتا ہے، اور وہ تاثر خود کسی صحیح علم پر مبنی نہیں ہوتا، اسی طرح کی اور بھی بہت سی باتیں ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے حق میں دوری اور بغض وعداوت رکھتے ہیں اور یہ حال دوسروں کو صحیح طور سے نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوتا ہے، آدمی کوئی تأثر کسی مضمون، کسی کتاب یا چند کتابوں یا کسی خاص واقعہ کی وجہ سے قائم

کر لیتا ہے جبکہ حقیقت اس سے کہیں وسیع اور کہیں دور ہوتی ہے۔

اختلاف کرنے والوں کو سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو اچھی طرح اور صحیح طور پر سمجھیں، اس میں کسی ردعمل، ادھر ادھر کے گمان اوران خیالات کا دخل نہ ہو جس کے پیچھے نہ مضبوط دلیل وحجت ہوتی ہے اور نہ ہی واقع ہوتا ہے۔

حقیقت کے مقابلے میں ان مخاصمانہ گفتگو وقصہ کہانیوں سے بڑھ کر اور برا جرم کیا ہوگا، جن کے بعد اور جن کے سامنے موضوعیت اور معاملہ فہمی کے لئے کوئی موقع نہیں رہ جاتا اور باہمی مذاکرہ کرنے والے کشتی کے میدان کے پہلوان بن جاتے ہیں۔

الف- اختلافات کو نباہنے کے علم وفن اور اس کے خصوصی مطالعہ سے استفادہ:

افراد وجماعتوں نیز اداروں وکمپنیوں وغیرہ میں جو باہم اختلافات ہوتے رہتے ہیں ان کو کس طرح نباہا جائے اور کس طرح ان کی بابت گفتگو کی جائے اس بارے میں بہت سی کتابیں ہیں جن سے اس میدان میں کام کرنے والے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک کتاب کا تذکرہ کیا جائے جو موضوع کے اعتبار سے بڑی مفید، نافع وجامع اور بہت اچھی کتاب ہے، جس کا نام ہے:

"فقه الائتلاف وقواعد التعامل مع المخالفين بالإنصاف"

جس کے مصنف "محمود محمد خزندار" ہیں، مؤلف نے اس کتاب میں ان اخلاق وآداب کا اچھا حصہ جمع کر دیا ہے جن کی رعایت اختلاف کرنے والوں کو اوران کے درمیان کرنی چاہئے۔

(٦)

حدیث افتراق کی ایجابی توجیہ و مفہوم

نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد بہت معروف ہے:

"إن بنی إسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملة وتفترق أمتی علی ثلاث وسبعین ملة کلهم فی النار إلا ملة واحدة، قالوا: ومن هی یا رسول الله؟ قال: ما أنا علیه وأصحابی" (حدیث گذر چکی ہے)۔

(بنی اسرائیل بہتر گروہوں میں بٹے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹے گی، سب کے سب جہنم میں جائیں گے بجز ایک کے، صحابہ نے عرض کیا کہ وہ ایک فرقہ کونسا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: یہ وہ فرقہ ہوگا جو اس چیز کو پکڑے جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ)۔

جن لوگوں نے بھی امت کے اختلافات پر گفتگو کی ہے، اس حدیث کا تذکرہ کسی نہ کسی طریق وسند سے کیا ہے، اور بعض لوگ مبالغہ سے کام لیتے ہیں تو اس کو بکثرت روایت و بیان کرتے ہیں حتی کہ عوام کے سامنے اور ان کے مجمع میں جو اس حدیث کو صحیح طور پر سمجھنے کی اور اس کی گہرائیوں کے ادراک و احاطہ کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لئے مجھے مناسب معلوم ہوا کہ میں حسب ذیل نقاط کے تحت اس حدیث پر کچھ روشنی ڈالوں:

اس حدیث کو شیخین نے اپنی صحیحین- بخاری ومسلم- میں ذکر نہیں کیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے، البتہ ان دونوں کا اس حدیث کو ذکر نہ کرنا، اس وجہ سے سمجھ میں آتا ہے- حقیقت تو اللہ ہی کو معلوم ہے- کہ یہ حدیث صحیحین کے اندر ان

دونوں کے لحاظ کردہ شرائط سے قاصر وخالی ہے۔

اس حدیث کو امام احمدؒ نیز اصحاب سنن نے متعدد طرق واسانید سے نقل کیا ہے، اور بہت سے حضرات نے اس کی تصحیح یا تحسین کی ہے جیسے ترمذی، حاکم، ذہبی، ابن تیمیہ، شاطبی، ابن حجر وغیرہ۔

بعض حضرات نے اس کی تضعیف بھی کی ہے، جیسے ابن حزم اور ابن الوزیر وغیرہ۔

اکثر کا مذہب ونظریہ حدیث کے ثبوت کا ہے، اس لئے کہ طرق کی کثرت وتعدد یہ دلیل ہے کہ حدیث کی اصل ضرور ہے۔

لیکن اس موضوع وباب کی یہ تنہا حدیث نہیں بلکہ اور بھی کچھ روایات واحادیث ہیں جن کو اس مسئلہ میں سامنے رکھنا چاہئے، مثلاً:

اولاً یہ کہ صحت کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد منقول ہے:

"امتی هذه امة مرحومة ليس عليها عذاب فی الآخرة عذابها فی الدنيا الفتن والزلازل والقتل" (میری یہ امت امت مرحومہ ہے، اس پر آخرت میں کوئی عذاب نہ ہوگا، اس کا عذاب تو دنیا میں فتنوں، زلزلوں اور قتل کی شکل میں ہوگا)۔

اس حدیث کو امام احمدؒ، ابوداؤد اور حاکم نے ابوموسی اشعریؓ سے روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے (اس کی تخریج گذر چکی ہے)۔

اس حدیث میں اس امت کی مرحومیت کی طرف اشارہ موجود ہے، اور اس بات کا کہ اس پر آخرت میں عذاب نہیں ہوگا، بلکہ اس کا عذاب دنیا میں ہی ہوگا، اور اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گنہگاروں میں کچھ لوگوں کو آخرت میں عذاب نہیں دیا جائے گا بلکہ یہ ہوگا جیسا کہ صحیحین وغیرہ کی احادیث میں آیا ہے۔

دوم: یہ امت اللہ تبارک وتعالی کے نزدیک سب سے افضل امت ہے، یہ امت کتاب

وسنت کے محکمات کی بنیاد پر قطعی یقین کے ساتھ پچھلی امتوں سے افضل ہے، لہذا یہ یہود کے زمانہ کی نسبت سے ان سے افضل اور نصاریٰ کے زمانہ کی نسبت سے ان سے افضل ہے، اسی لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

"کنتم خیر أمة أخرجت للناس" (آل عمران:۱۱۰) (تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے)۔

نیز فرمایا ہے: "وکذلک جعلناکم أمة وسطاً" (البقرہ:۱۴۳) (اور ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنادی ہے کہ جو اعتدال پر ہے)۔

اور اس بابت نبی اکرم ﷺ کے ارشادات متواتر وقطعی ہیں، لہذا یہ امت افضل الامم ہے، اور حدیث سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ پچھلی اِمتوں میں اس امت سے کم اختلاف ہوا تو وہ امتیں اس امت سے افضل ہیں یا یہ کہ اس سے کم شر والی ہیں۔

سوم: صحیحین میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ ہم لوگ نبی ﷺ کے ساتھ ایک قبہ (گول خیمہ) میں تھے آپ نے فرمایا کہ کیا تم لوگ اس پر راضی ہو کہ اہل جنت کے چوتھائی ہو، ہم نے عرض کیا، جی ہاں، فرمایا: کیا تم اس پر راضی ہو کہ اہل جنت میں نصف ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ جی ہاں: فرمایا:

"والذی نفس محمد بیده إنی لأرجو أن تکونوا نصف أهل الجنة وذلک أن الجنة لا یدخلها إلا نفس مسلمة وما أنتم فی أهل الشرک إلا کالشعرة البیضاء فی جلد الثور الأسود أو کالشعرة السوداء فی جلد الثور الأحمر" (صحیح بخاری:۶۵۲۸ واللفظ لہ صحیح مسلم:۲۲۱)۔

(اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے مجھ کو یہ امید ہے کہ تم لوگ اہل جنت میں نصف ہو گے، اور یہ اس لئے کہ جنت میں صرف مسلمان ہی جائے گا، حالانکہ

تم اہل شرک کے مقابلے میں کالے بیل کی کھال کے سفید بال، یا سرخ بیل کی کھال کے کالے بال کی طرح ہو (نسبت میں))۔

اپنے اس ارشاد میں نبی ﷺ نے اس امت کو یہ بشارت سنائی ہے کہ جنت میں داخل ہونے والوں میں نصف آپ ﷺ کے اتباع میں ہوں گے۔

چہارم: اللہ تبارک وتعالی نے اس امت کے خطا ونسیان کو معاف کردیا ہے جیسا کہ سورہ بقرہ کے آخر میں آیا ہے:

"ربنا لا تواخذنا إن نسينا أو أخطأنا" (البقرہ:۲۸۶) (اے ہمارے پروردگار ہم پر دارو گیر نہ فرمایئے اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں)۔

حدیث صحیح میں آیا ہے:

"إن الله تجاوز عن أمتي الخطأ والنسيان وما استكرهوا عليه" (ابن ماجہ: ۲۰۴۳، واللفظ لہ عن أبي ذرؓ، ۲۰۴۵، ابن حبان: ۷۲۱۹، طبرانی الصغیر: ۷۶۵، دارقطنی ۴/۱۷۰، بیہقی سنن کبری ۷/۳۵۶ کلہم عن ابن عباسؓ)۔

اور یہ مضمون فی الجملہ قطعی ہے اور فقہاء واصولیین کے نزدیک مقبول ومعتبر ہے۔

پنجم: اللہ سبحانہ وتعالی نے اس امت سے وہ سارے بوجھ جو (سخت احکام کی شکل میں) سابقہ امتوں پر تھے وہ سب ختم کردیئے ہیں، چنانچہ ارشاد ہے:

"الذين يتبعون الرسول النبي الأمي الذي يجدونه مكتوباً عندهم في التوراة والإنجيل يأمرهم بالمعروف وينهاهم عن المنكر ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث ويضع عنهم إصرهم والأغلال التي كانت عليهم" (الاعراف:۱۵۷)۔

(جو لوگ ایسے رسول نبی امی ﷺ کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں کہ وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے

منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتلاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں)۔

اہل علم کا ایک حلقہ اس امت میں فرق کی کثرت کو جس کا تذکرہ حدیث میں آیا ہے مشکل سمجھتا و بتاتا ہے (کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی)، اس کے کئی جوابات دیئے جاسکتے ہیں، مثلاً:

- اس امت کی عمر کا طویل ہونا اور اس کا تاریخی پھیلاؤ۔
- سابقہ امتوں کے تفرق -گروہ بندی- کے مقابلے میں اس امت کا تفرق شر میں کمتر ہے، اور تفرق و گروہ بندی کے نتیجے میں اس امت کے اندر جو کمی پائی جاتی ہے اس کے مقابلے میں اس کی وجہ سے امت کے اندر مختلف قسم کا خیر و فضل بھی پایا جاتا ہے، اور فرقہ کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ ایک جماعت یا بڑی جماعت پر مشتمل ہو، بلکہ دو آدمیوں کے درمیان اختلاف و افتراق کی صورت بھی گروہ بندی کی ہے، لہذا اگر امت میں بہت سے فرقے بھی ہوں تو وہ مجموعی طور پر امت کا ایک تھوڑا سا نیز محدود حصہ ہوں گے۔
- یہ ایک ادعائی چیز ہے کہ آدمی صرف اپنی ذات کو فرقہ ناجیہ قرار دے اور بقیہ سب کو ضلال و گمراہی کے ساتھ متصف کر کے سب کو جہنمی قرار دے، نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"إذا قال الرجل: هلک الناس فهو أهلكهم" (مسلم: ۲۶۲۳) (جب کوئی آدمی اس طرح بات کرتا ہے کہ لوگ تو ہلاک ہیں، ہلاک ہو گئے تو وہ دوسروں سے بڑھ کر ہلاکت میں ہوتا ہے، یا یہ کہ وہ دوسروں کی ہلاکت کا ذریعہ بنتا ہے)۔

اور ہدایت والا فرقہ -دراصل- ایک منہج و نظریہ ہے جیسا کہ حدیث خود بتاتی ہے اور وہ منہج و نظریہ ہے- "ما أنا عليه وأصحابي"، یعنی اس چیز کو پکڑنے اور اس پر چلنے کا جس پر

نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ تھے، اور کوئی پختہ کار اپنی نجات کا طالب یہ کہے کہ اس کی زندگی اسی کے مطابق ہے جس پر نبی ﷺ اور صحابہ تھے، یہ مناسب نہیں ہے۔

یہ مذکورہ فرقے جن کے متعلق نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ ان کے افراد آپ کی امت سے ہوں گے، اس لئے کہ آپ نے فرمایا ہے: "ستفترق هذه الأمة" (یہ امت بٹے گی) اور "ستفترق أمتي" (میری امت بٹے گی)، یہ فرقے کفار ومشرک نہیں ہیں بلکہ مسلمان وصاحب ایمان ہیں، ان میں کچھ منافق ہو سکتے ہیں لیکن زیادہ تر اہل ایمان واہل اسلام ہوں گے، اگرچہ ان کے اندر اہل حق سے ایک قسم کا اختلاف اور کمی پائی جائے- اہل علم- ابن تیمیہ وشاطبی وغیرہ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے (ملاحظہ ہو: مجموع الفتاوی ۷/۲۱۷، ۲۱۸، صفۃ الغرباء ۲/۶۲)۔

پھر یہ وعید ہے جس کا تحقق ضروری نہیں ہے، اسی لئے ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

نبی اکرم ﷺ کا فرمان: بہتر فرقے جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں- حق تعالی کے ارشاد سے بڑھ کر نہیں ہے۔

"إن الذين يأكلون أموال اليتامى ظلماً إنما يأكلون في بطونهم ناراً وسيصلون سعيراً" (النساء:۱۰) (بلاشبہ جو لوگ تیموں کا مال بلا استحقاق کھاتے ہیں اور کچھ نہیں وہ اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں اور عنقریب جلتی آگ میں داخل ہوں گے)۔

نیز اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے:

"ومن يفعل ذلك عدواناً وظلماً فسوف نصليه ناراً" (النساء:۳۰)۔

(اور جو شخص ایسا فعل کرے گا، اس طور پر کہ حد سے گذر جائے اس طور پر کہ ظلم کرے تو ہم عنقریب اس کو آگ میں داخل کریں گے)۔

نیز اس قسم کی اور آیات جو برا کام کرنے والوں کے حق میں جہنم میں داخل ہونے وجانے کو صراحۃً بتاتی ہیں (ملاحظہ ہو: منہاج السنہ ۵/۲۴۹)۔

ان صراحتوں کے باوجود ہم کسی معین شخص کے حق میں جہنم کی بات نہیں کہہ سکتے کیونکہ امکان ہے کہ اس نے اپنے گناہ سے توبہ کرلی ہو، یا اس کے پاس ایسی نیکیاں ہوں جنہوں نے اس کی سیئات کو مٹادیا ہو، یا مصائب وغیرہ کو اللہ تعالی نے اس کے حق میں کفارہ بنادیا ہو۔

اور سلف رحمہم اللہ کی شان یہ نہ تھی کہ ان فرق وگروہوں کی نشاندہی وتعیین کریں جیسا کہ شاطبی نے موافقات میں ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو: الموافقات ۴/۱۸۱-۱۸۵) اور ابن تیمیہ وغیرہ نے بھی۔

ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"اسی طرح تمام بہتر فرقے، ان میں جو منافق ہوگا وہ تو باطن میں کافر ہے، اور جو منافق نہیں ہے بلکہ باطن میں بھی اللہ اور رسول پر ایمان رکھنے والا ہے تو وہ کافر نہیں ہے اگرچہ وہ تاویل میں خطا کار ہو اور کیسی ہی خطا کرے" (ملاحظہ ہو: مجموع الفتاوی ۷/۲۱۸)۔

نیز یہ بھی فرمایا ہے:

"جب مومن کہتا ہے: "ربنا اغفر لنا ولإخواننا الذين سبقونا بالإيمان" (الحشر: ۱۰) (اے ہمارے پروردگار! ہم کو بخشدے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لاچکے ہیں) تو وہ ان سب کا ارادہ کرتا ہے جو اس سے پہلے صاحب ایمان گذرے ہیں اگرچہ کسی تاویل میں وہ خطا کار ہوں کہ ان کی تاویل خلاف سنت ہو، یا گنہگار ہوں، بہرصورت وہ اس کے بھائی اور ایمان میں اس سے سابق ہیں، لہذا اس آیت کے عموم میں سب داخل ہیں اگرچہ بہتر فرقوں میں سے ہوں اس لئے کہ ہر فرقہ میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کافر نہیں ہیں، بلکہ مومن ہیں جن میں گمراہی وگناہ ضرور پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ وعید کے مستحق ہیں جیسے کہ مخلص ایمان والے نافرمانوں کا معاملہ ہے" (ملاحظہ ہو: منہاج السنہ ۵/۲۴۰، ۲۴۱)۔

پھر وہ فرماتے ہیں:

"حالانکہ بہتر فرقوں والی حدیث صحیحین میں نہیں ہے اور ابن حزمؒ وغیرہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، لیکن دوسرے حضرات نے اس کو حسن یا صحیح کہا ہے، حاکم وغیرہ نے بھی اس کو صحیح کہا ہے، اہل سنن نے اس کی روایت کی ہے اور یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے" (ملاحظہ ہو: منہاج السنہ ۲۴۹/۵)۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہے کہ اس قسم کی حدیث کو اس کے صحیح و مناسب دائرہ میں رکھا جانا چاہیے، اور اس کو مسلمانوں کے درمیان افتراق و اختلاف کے پھیلنے و پھیلانے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔

میں نے شیخ عبداللہ بن یوسف الجدیع کا ایک قیمتی و وقیع مضمون عنوان ذیل پر پڑھا ہے: أضواء على حديث افتراق الأمة (افتراق امت والی حدیث پر کچھ روشنی) میں اس کے مطالعہ کی (دوسروں کو بھی) تاکید کرتا ہوں۔

فصل سوم

اختلاف کے بنیادی قواعد

۱۔ اسباب اختلاف

۲۔ اختلاف کے علمی قواعد

۳۔ اختلاف کے عملی قواعد

۴۔ اختلاف محمود و اختلاف مذموم

(۱)

اسباب اختلاف

اختلاف ایک ضروری چیز ہے، اور یہ قیامت تک امت میں رہے گا اور علماء ہی امت کا اصل الاصول ہیں، اور جیسے دوسروں میں اختلاف پایا جاتا ہے ان کے درمیان بھی پایا جاتا ہے اور ان کا اختلاف بہت سے اسباب سے تعلق رکھتا ہے جن کو علماء نے ذکر و جمع کیا ہے، اور اس بارے میں بہت سے رسائل و کتابیں بھی لکھی گئی ہیں مثلاً ابن تیمیہؒ کی کتاب "رفع الملام"، ابن السید بطلیوسی کی "التنبیه علی الأسباب التی أوجبت الخلاف"، شاہ ولی اللہ دہلوی کی "الإنصاف فی بیان أسباب الاختلاف" وغیرہ۔

ہم بعض اسباب کا مختصراً تذکرہ کرتے ہیں:

(۱) دلیل سے ناواقفیت:

سنت نبویہ قرآن کریم کے مبہم و مجمل مضامین کی شارح و تفصیل کرنے والی ہے اور ہم کو خوب معلوم ہے کہ سنت نبویہ (پوری کی پوری) تمام علماء تک نہیں پہنچ سکی، بعض حصہ بعض علماء کی واقفیت و دسترس سے دور رہا، اور یہ بات خود صحابہؓ کے حق میں بھی پائی گئی کہ ایسا ہوا کہ ایک صحابی کے پاس ایک دلیل ہوئی اور دوسرے صحابی کے علم میں وہ نہیں رہی، اس لئے ایسا بھی ہوا کہ ناواقف کو جب دلیل بتائی گئی تو اس نے رجوع کرلیا۔

صحیحین میں آیا ہے کہ حضرت ابوموسی اشعریؓ حضرت عمرؓ سے ملنے پہنچے اور حاضری کی اجازت چاہی، اجازت نہیں ملی، دوسری و تیسری مرتبہ میں بھی نہیں ملی، حضرت عمرؓ بظاہر کسی کام

میں مشغول تھے، حضرت ابوموسیٰؓ اجازت نہ ملنے پر واپس ہوگئے، حضرت عمرؓ جب اپنے کام سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ میں نے عبداللہ بن قیس (یعنی ابوموسی اشعری) کی آواز سنی تھی؟ ان کو بلالو، لوگوں نے کہا کہ وہ تو واپس چلے گئے، حضرت عمرؓ نے ان کو بلوایا جب وہ حضرت عمرؓ کے پاس لائے گئے تو حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ آپ رکے کیوں نہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں نے تین مرتبہ اجازت چاہی اجازت نہیں ملی تو واپس چلا گیا اور رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے:

"إذا استأذن أحدكم ثلاثاً فلم يؤذن له فليرجع" (جب تم میں سے کوئی کسی سے ملنے کی اجازت چاہے اور تین مرتبہ، لیکن اس کو اجازت نہ ملے تو واپس چلا جائے)۔

اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپ کو اس پر بینہ (شرعی گواہ) پیش کرنا ہوگا (کہ حضور ﷺ نے ایسا فرمایا ہے)۔

حضرت ابوموسیٰؓ پریشان حال حضرات انصار کی ایک مجلس میں پہنچے اور ان سے ساری بات ذکر کی، تو حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا کہ ہم میں کا سب سے چھوٹا آدمی آپ کے ساتھ جائے گا، چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ اٹھے اور ان کے ساتھ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے، اور ان کو بتایا کہ نبی اکرم ﷺ نے ایسا فرمایا تھا (ملاحظہ ہو: صحیح بخاری: ۲۰۶۲، ۶۲۴۵، مسلم: ۲۱۵۳) کہ اگر کوئی آدمی تین مرتبہ اجازت طلب کرے تو اگر اس کو اجازت مل جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ واپس ہو جائے۔

بلکہ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ تم کو صحابہ کی ایک پوری جماعت ایسی مل جائے کہ جن کے علم میں ایک حدیث نہ ہو، اور جب ان کو علم ہوا تو انہوں نے اس پر عمل کیا۔

اس کی دلیل بخاری وغیرہ کی روایت ہے کہ صحابہ جب شام تشریف لائے تو ان کو علم ہوا کہ شام میں طاعون کی وبا موجود ہے، ان کو تردد ہوا کہ شام میں داخل ہوں یا داخل نہ ہوں؟ حضرت عمرؓ نے اکابر مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا، انہوں نے وباء ومرض کے باوجود شام میں

داخل ہونے کا مشورہ دیا، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فتح مکہ کے موقع سے اسلام لانے والوں سے مشورہ فرمایا انہوں نے داخل نہ ہونے کا مشورہ دیا، حضرت عمر تردد میں پڑ گئے، اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ - جو کسی ضرورت کے تحت کہیں گئے ہوئے تھے - وہاں پہنچ گئے انہوں نے فرمایا: میرے پاس اس بابت ایک علم ہے، میں نے نبی اکرم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے:

"إذا سمعتم به بأرض فلا تقدموا عليه وإذا وقع بأرض وأنتم بها فلا تخرجوا منه" (بخاری:۵۷۲۹، واللفظ لہ، مسلم:۲۲۱۹)۔

(جب تم لوگ طاعون کے متعلق سنو کہ کسی جگہ ہے تو اس جگہ مت جاؤ اور جب تم کسی جگہ موجود ہو اور وہاں یہ بیماری آجائے تو اس جگہ سے مت نکلو)۔

عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی یہ روایت حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق نکلی کہ وہ شام میں مسلمانوں کے داخل نہ ہونے کا رجحان رکھتے تھے کیونکہ وہاں طاعون پھیلا ہوا تھا۔

تو صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ ایک بلکہ زائد احادیث بعض لوگوں کے علم میں نہ ہوتی تھیں، جب کسی سے علم ہو جاتا تو اس کو اپنا لیتے، اسی طرح بعد کے علماء کا معاملہ رہا، اس طرح اختلاف کا ایک سبب یہ بھی بنا کہ ایک عالم کو کسی دلیل کا علم نہیں رہا تو اس کی رائے اس کے خلاف رہی۔

اسی لئے امام شافعیؒ امام احمدؒ سے فرماتے تھے:

"إذا صح عندكم الحديث عن رسول الله ﷺ فأخبرونا به حتى نرجع إليه" (ابونعیم فی حلیۃ الأولیاء ۹/ ۱۷۰، ابن عساکر فی تاریخ دمشق ۵۱/ ۳۸۵)۔

(جب تم کو رسول اللہ ﷺ کی کسی صحیح حدیث کا علم ہو تو ہم کو بتا دیا کرو تا کہ ہم اس کی طرف رجوع کر سکیں)۔

اور ائمہ اربعہ - ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد - رحمہم اللہ ان میں سے ہر ایک یہ کہا کرتے تھے:

"إذا صح الحديث فهو مذهبي" (جب کوئی حدیث صحت کے ساتھ ثابت ہو تو

وہ میرا مذہب ہے)۔

اور وہ لوگ پیش آمدہ مسئلہ میں اپنے قول ورائے کو حدیث کے ملنے وثابت ہونے پر موقوف رکھتے تھے۔

ب-دلیل کا بھول جانا یا ذہول وغفلت:

کبھی ایک دلیل کا عالم کو علم تو ہوتا ہے مگر وہ اس کو بھول جاتا ہے یا اس کی بابت اس کو ذہول ہو جاتا ہے، حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو ایک سورت پڑھتے سنا تو فرمایا:

"یرحمه الله لقد اذکرنی کذا وکذا آیة کنت أنسیتها من سورة کذا وکذا" (بخاری:۵۰۳۸ واللفظ لہ، مسلم:۷۸۸)۔

(اللہ اس پر رحم کرے کہ اس نے مجھ کو فلاں سورت کی فلاں فلاں آیت یاد دلادی جس کو میں بھول گیا تھا)۔

علماء جرح وتعدیل کی کتابوں میں اس قسم کی چیزیں آئی ہیں، سیوطیؒ نے تو ایک کتاب ہی تالیف فرمائی ہے جس کا نام ہے: تذکرة المؤتسی فیمن حدث ونسی۔

حتی کہ بعض محدثین اس طرح بھی روایت کیا کرتے تھے کہ مجھ سے فلاں نے بیان کیا کہ میں نے اس سے ایسا ایسا بیان کیا ہے، یہ اس لئے کہ حدیث بیان کرنے کے بعد آدمی حدیث کو بھول گیا، تو جس سے سنا اس کے واسطے سے روایت کیا یہ کہہ کر کہ اس نے مجھ سے سن کر یہ حدیث بیان کی ہے ایسا بہت ہوا ہے، ابن الصلاح وغیرہ علماء نے اس کی مثالیں ذکر کی ہیں (ملاحظہ ہو: مقدمہ ابن الصلاح ر۱۱۶، تدریب الراوی ار۳۳۵، ۳۳۶)۔

انسان بھولی ہوئی چیز یاد آنے پر اس پر عمل کرتا ہے اس کی مثالوں میں حضرت ابومسعود وحذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما کا واقعہ ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے ایک مرتبہ مدائن کے اندر امامت

فرمائی تو ایک بلند جگہ پر کھڑے ہوئے (اور مقتدی سب نیچے تھے) تو حضرت ابو مسعودؓ نے ان کا کرتا پکڑ کر کھینچا چنانچہ وہ نیچے آ گئے اور مقتدیوں کے برابر جگہ میں کھڑے ہو کر نماز پڑھائی، نماز کے بعد حضرت ابو مسعودؓ نے ان سے فرمایا آپ کو معلوم نہیں کہ صحابہ کو اس سے منع کیا گیا کہ امام ۔بغیر مجبوری کے۔مقتدیوں سے اوپر و بلند ہو، انہوں نے فرمایا: خوب معلوم ہے، آپ نے جب مجھ کو کھینچا تو یاد آ گیا (ابوداود: ۵۹۷، حاکم ۱/۳۲۹)۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ جب آپ نے مجھ کو نیچے کی طرف کھینچا تو مجھ کو حدیث یاد آ گئی، تو حضرت حذیفہؓ کو یہ حدیث بھول گئے تھے، لیکن جیسے ہی حدیث یاد آئی فوراً اس کی موافقت کی اور بلند جگہ سے نیچے کو آ گئے ☆

ج۔دلیل کا ثابت نہ ہونا:

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عالم تک ایک حدیث پہنچتی ہے لیکن اس کے نزدیک وہ ثابت نہیں ہوتی (یعنی قابل عمل نہیں ہوتی) جبکہ احادیث و آثار کی تصحیح و تضعیف میں بھی علماء حدیث کا

☆ مسئلہ یہ ہے کہ امام اگر مقتدیوں کی نسبت سے بلند جگہ پر کھڑا ہو اور کوئی ضرورت اس کی داعی ہو تو یہ جائز ہے، حضور ﷺ سے اس طرح بلند جگہ نماز پڑھنا ثابت ہے، چنانچہ حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ سے ایک متفق علیہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فلاں عورت۔جس کا سہل نے نام بھی ذکر کیا اس۔کو پیغام بھیجا کہ اپنے لکڑی کا کام کرنے والے غلام سے کہو کہ میرے لئے لکڑی کا منبر بنا دے تاکہ لوگوں سے خطاب کے لئے میں اس پر بیٹھا کروں، چنانچہ ان خاتون کے حکم سے اس غلام نے جنگل کے جھاؤ کے درخت سے منبر تیار کیا اور خاتون کو پیش کر دیا، انہوں نے آپ کو پیش کیا اور وہ مسجد میں یہاں پر رکھا گیا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اس پر کھڑے ہو کر نماز پڑھی، اس پر کھڑے کھڑے تکبیر تحریمہ کہی، پھر اسی پر رکوع کیا، اور اتر کر پیچھے کو ہٹے اور سجدہ فرمایا (منبر سے نیچے متصل) اس کے بعد پھر منبر پر چلے گئے، نماز سے فارغ ہو کر سب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: اے لوگو! میں نے یہ محض اس لئے کیا تاکہ تم میری اقتدا کرو اور میری نماز کو جانو دیکھو (بخاری: ۹۱۷، مسلم: ۵۴۴)، یہ مسئلہ فقہی یا فرعی حیثیت سے ہمارے لئے اہم نہیں ہے، اہم بات یہ ہے کہ اختلاف علمی کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک عالم کے علم میں دلیل رہتی ہے مگر وہ اس کو بھول جاتا ہے، اس کی وجہ سے اس کے خلاف فتویٰ بھی دیتا ہے، بعد میں جب اس کو یاد دلایا جاتا ہے یا یاد آتا ہے تو دلیل کی طرف رجوع کر لیتا ہے۔

اختلاف رہا ہے اور ہوتا ہے جیسے کہ فقہاء بعض احکام فقہیہ میں اختلاف کرتے ہیں۔

اس سلسلہ کی مثالوں میں یہ ہے کہ بے وضو آدمی کا قرآن مجید کو ہاتھ لگانا مختلف فیہ ہے، ائمہ اربعہ فرماتے ہیں کہ بے وضو آدمی کو قرآن مجید کو ہاتھ نہیں لگانا چاہئے، انہوں نے یہ مسئلہ اس حدیث سے اخذ کیا ہے:

"لا يمس القرآن إلا طاهر" (قرآن کریم کو پاک آدمی ہی ہاتھ لگائے)۔

یہ حدیث مجموعی طور پر حسن ہے، اور حضرت عمرو بن حزم (موطا مالک: ۴۶۹، ابوداؤد فی المراسیل: ۹۲، ابن حبان: ٦٥٥٩، دارقطنی ۱/ ۱۲۲، حاکم فی المستدرک ۱/ ۵۵۲، ولالکائی فی شرح اصول الاعتقاد: ۵۷۲، بیہقی سنن کبری ۱/ ۳۰۹، بیہقی فی شعب الایمان: ۲۱۱۱، ابن الجوزی فی التحقیق فی احادیث الخلاف: ۲۶۰)، حکیم بن حزام (الطبرانی فی المعجم الکبیر: ۳۱۳۵، ولالکائی فی شرح اصول الاعتقاد: ۵۷۴)، عبداللہ بن عمر (الطبرانی فی المعجم الکبیر: ۱۳۲۱۷، دارقطنی ۱/ ۱۲۱، ولالکائی فی شرح اصول الاعتقاد: ۵۷۳، بیہقی سنن کبری ۱/ ۸۸) سے مروی ہے، ایسے ہی حق تعالی کا ارشاد آیت کریمہ میں ہے:

"لا يمسه إلا المطهرون (الواقعہ: ۷۹) (اس کو بجز پاک فرشتوں کے کوئی ہاتھ نہیں لگانے پاتا)۔

اور طبری، ابن حزم نیز علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ بے وضو آدمی قرآن مجید کو چھو سکتا ہے، اس لئے کہ حدیث ان کے نزدیک ثابت نہیں ہے (ملاحظہ ہو: تفسیر طبری ۲۷/ ۲۰۶، محلی ۱/ ۸۱-۸۴، الاستذکار ۲/ ۴۷۱-۴۷۳، تفسیر بغوی ۴/ ۲۸۹، المغنی ۱/ ۹۸، تفسیر قرطبی ۱۷/ ۲۲۶)۔

د- دلیل کا مقصود پر دلالت نہ کرنا:

نصوص کی دلالت کی دو قسمیں ہیں:

قسم اول: قطعی دلالت، قطعی الدلالۃ نصوص وہ کہلاتی ہیں جو صرف ایک معنی پر مشتمل ہوں اور ان کے اندر دوسرے معنی کا احتمال نہ ہو، جیسے حق تعالی کا ارشاد:

"ولكم نصف ما ترك أزواجكم إن لم يكن لهن ولد" (النساء:۱۲) (اور تم کو آدھا ملے گا اس ترکہ کا جو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں اگر ان کے کچھ اولاد نہ ہو)۔

یہ آیت ایسی ہے کہ اس کے معنی ومفہوم کے سمجھنے میں دو آدمی ایک دوسرے سے اختلاف نہیں کر سکتے، اس لئے کہ نصف کا لفظ سب کے نزدیک معروف ہے، اسی لئے علماء آیت کی دلالت ومعنی پر متفق ہیں۔

قسم دوم: دلالت ظنیہ، ظنی الدلالۃ نص وہ ہوتی ہے جس میں ایک سے زائد معنی کا احتمال ہو، اگر چہ ان معانی میں سے بعض دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ ظاہر و واضح ہوں، اس کی معروف ترین مثالوں میں حق تعالی کا ارشاد ہے:

"والمطلقات يتربصن بأنفسهن ثلاثة قروء" (البقرہ:۲۲۸) (اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو (نکاح سے) روکے رکھیں تین قروء تک)۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ مطلقہ کی عدت تین قروء ہے، لیکن قروء کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے: بعض کا کہنا ہے کہ یہ طہر کے معنی میں ہے اور مراد ہے کہ تین طہر عدت کے گذارے گی، اور بعض کا قول ہے کہ طہر سے مراد حیض ہے اور تین حیض عدت گذارے گی۔

عربی زبان کی رو سے دونوں معنی کی گنجائش ہے، اس لئے کہ لفظ قرء اضداد میں سے ہے، طہر اور حیض دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، تو لفظ قرء کی دونوں معانی میں سے کسی ایک پر دلالت ظنی دلالت ہے، اور مختلف فیہ ہے۔

حاصل یہ کہ ایک عالم کے علم میں دلیل ہوتی ہے اور ثابت بھی ہوتی ہے، اور اس کو یاد بھی ہوتی ہے، لیکن وہ عالم یہ سمجھتا ہے کہ یہ دلیل امر مقصود پر دلالت نہیں کرتی، اس لئے وہ اس مسئلہ میں اختلاف کرتا ہے۔

ہ- راجح معارض کا پایا جانا:

کبھی حکم کا تقاضا کرنے والی دلیل ثابت ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ ہوتا ہے کہ دوسری دلیل اس سے قوی اس کے معارض موجود ہوتی ہے، اس کی وجہ سے اختلاف ہوجاتا ہے، ایک آدمی ایک دلیل کو کمزور سمجھ کر دوسری قوی دلیل کو اختیار کرتا ہے اور دوسرا اس کو کمزور سمجھ کر دوسری کو قوی سمجھ کر ترجیح دیتا ہے۔

اس کی مثالوں میں مس ذکر کی وجہ سے وضو ٹوٹنے کا مسئلہ ہے، اس مسئلہ میں دو متعارض حدیثیں موجود و معروف ہیں، ایک بسرہ بنت صفوانؓ کی انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہے:

"من مس ذكره فليتوضأ (احمد: ۲۷۳۳۴، ابوداؤد: ۱۸۱، واللفظ لہ، نسائی: ۴۴۷، ترمذی: ۸۲، وقال حسن صحیح، ابن ماجہ: ۴۷۹، وصححہ ابن حبان: ۱۱۱۶)۔

(جو آدمی اپنی پیشاب گاہ کو ہاتھ لگائے وہ وضو کرے)۔

یہ مس ذکر کی وجہ سے وضو کے وجوب کی دلیل ہے۔

دوسری حدیث حضرت طلق بن علیؓ کی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اگر کوئی آدمی اپنی پیشاب گاہ کو ہاتھ لگائے تو کیا اس کو وضو کرنا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: وہ تمہارے بدن وجسم کا ایک ٹکڑا و حصہ ہی تو ہے (احمد: ۱۶۳۲۹ واللفظ لہ، ابوداؤد: ۱۸۲، نسائی: ۱۶۵، ترمذی: ۸۵، ابن ماجہ: ۴۸۳)۔ لہذا جیسے تم اپنے پیر، ناک، کان کو ہاتھ لگاؤ تو وضو نہیں ہے اسی طرح اس صورت میں بھی وضو نہیں ہے۔

یہ دونوں دلیلیں بظاہر متعارض ہیں، بعض علماء پہلی حدیث کو راجح مان کر وضو کے وجوب کے قائل ہیں اور بعض دوسری کو راجح مانتے ہیں اور مس ذکر کی وجہ سے وضو کے وجوب کے قائل نہیں ہیں۔

جن لوگوں نے پہلی حدیث کو ترجیح دی اور وضو کے وجوب کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ

یہ حدیث اصل سے منتقل کرنے والی ہے کہ اصل ہے: وضو کا واجب نہ ہونا، اور اس حدیث سے ہم کو معلوم ہوا کہ یہاں نسخ ہوا ہے اور طلق بن علیؓ کی حدیث منسوخ ہے۔

بعض حضرات نے دونوں کو جمع کرتے ہوئے کہا کہ مس ذکر کی وجہ سے وضو واجب تو نہیں البتہ مستحب ہے۔

و- خواہش نفس و تعصب:

یہ سبب ایسا ہے کہ جو اختلاف مذموم کی طرف لے جاتا ہے اور ہم یہ نہیں مانتے کہ ہر اختلاف کرنے والا، خواہش نفس کا متبع ہوتا ہے، بلکہ علماء کا اختلاف اکثر پیچھے مذکور اسباب یا ان جیسے اسباب کی وجہ سے ہوا ہے، البتہ کبھی کبھی علم وفقہ سے نسبت رکھنے والے بعض لوگ بھی تعصب وخواہش نفس کی بنیاد پر بعض باتیں کہہ جاتے ہیں۔

اور مسلمانوں کی تاریخ میں تعصب بڑا خطرناک ثابت ہوا ہے کہ اس کی وجہ سے نہ جانے کتنی قومیں، حکومتیں اور علاقے تباہ و برباد ہو گئے، اور نہ جانے کتنے فتنے و جھگڑے بلکہ جنگیں سامنے آئیں۔

بہر حال تعصب وخواہش نفس بھی اختلاف کا ایک سبب ہے کہ اس کے نتیجہ میں آدمی ایک قول کے ضعف کو جانتے ہوئے بھی اس کو مضبوطی سے پکڑے رہتا ہے محض اس وجہ سے کہ وہ اس کے مذہب کا حکم ہے یا اس کا قول ہے جس کی وہ تعظیم کرتا ہے۔

ز- قوت کا فرق و تفاوت:

قوت وطاقت شخصی بھی ہوتی ہے اور ذمہ داریوں کے بوجھ کی بھی، نیز ذہانت کی بھی ہوتی اور اس کی زیادتی و تیزی کی، بعض علماء ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس ذہانت کی قوت، فہم کی پختگی، نیز عقل کی وسعت ہوتی ہے، اور پھر اس کے ساتھ شخصی وذاتی استطاعت وصلاحیت بھی

ہوتی ہے، جس کی بنا پر آدمی کو یہ گنجائش ہو جاتی ہے کہ وہ بہت سے مسائل میں دوسروں سے اختلاف کرے اور ان میں اپنی خاص رائے رکھے۔

اسی لئے حضرت عمر بن خطابؓ سے بہت سی ایسی چیزیں منقول ہیں جن میں انہوں نے بعض صحابہ سے مخالفت کی ہے اور یہ محض اس وجہ سے ہوا کہ حق تعالی نے ان کو فہم و عقل کی خاص صلاحیت و طاقت عطا کی تھی اور اس کے بعد نیز اس کے ساتھ خود ان کی شخصیت کی بھی ایک حیثیت اور صلاحیت و قوت تھی۔

بعض علماء، بعض مسائل کے اندر اپنی کوئی خاص رائے یا قول رکھتے ہیں لیکن اس کو وہ اپنے سینہ و دل میں ہی رکھتے ہیں، زبان سے اس کا اظہار نہیں کرتے اس لئے کہ اس کے نتائج و عواقب سے وہ ڈرتے ہیں، اور اپنی وفات کے بعد ہی اس کی اشاعت کی اور سامنے لانے کی وصیت کرتے ہیں، کیونکہ ان کو یہ خوف ہوتا ہے کہ وہ ان چیزوں کو برداشت نہیں کر سکیں گے جو اس قسم کے فتاوی کو نیز ایسے اقوال و آراء کو منظر عام پر لانے کی وجہ سے سامنے آئیں گی اور پیدا ہوں گی۔

ح۔ مبلغ علم کا فرق:

ایک سبب علم کی کمی و زیادتی کا اختلاف بھی ہے، یہ اس اعتبار سے بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی کا علم کم اور دوسرے کا زیادہ ہے، اور اس نسبت سے بھی کہ ایک ہی آدمی کا علم کسی زمانے میں کم اور کچھ جبکہ دوسرے زمانہ میں اس سے زیادہ اور کچھ اور ہوتا ہے، چنانچہ ایک آدمی بعض مسائل میں کچھ آراء و اقوال رکھتا ہے، اور اس کے علم میں وسعت ہوتی رہتی ہے تو اس کے مطابق ان مسائل و آراء میں نظر ثانی کرتا رہتا ہے اور پھر اپنے فتوی کو بھی بدل دیتا ہے، یہ ہر عالم کے ساتھ ہوتا ہے، بلکہ کثرت سے شراح حدیث نووی، ابن حجر، وغیرہ، ایسی احادیث جو بظاہر متعارض ہوتی ہیں ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو بعد میں کسی بات کا علم ہوا

جو آپ کو پہلے نہ تھا اور حق ہے ارشاد باری تعالیٰ:

"وقل رب زدنی علما" (طٰہٰ:۱۱۴) (اور آپ یہ دعا کیجئے اے میرے رب میرا علم بڑھا دیجئے)۔

ط- حالات کا فرق واختلاف:

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حالات ومعاملات نیز ماحول ومعاشرہ کا فرق واختلاف ہوتا ہے جو مسائل میں اختلاف کا باعث بنتا ہے، اس لئے کہ ایک وہ ماحول ہے جس میں لوگ مضبوطی سے دین پر عامل وکاربند ہوتے ہیں اور دوسرا وہ ماحول ہے جس میں دین سے تعلق اور اس پر عمل کمزور ہوتا ہے ان دونوں حالتوں میں فرق ہوتا ہے اور کیا جاتا ہے، جیسے کہ خوشحالی وخوش عیشی کی حالت نیز تنگ حالی وتنگی معیشت کی حالت کا فرق ہوتا ہے۔

علماء کے باہمی اختلافات کے یہ چند اسباب ہیں، یہ اسباب کچھ اور مزید بھی ہو سکتے ہیں، باقی ان سب کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ اختلاف ضروری وناگزیر ہے، جو مسلمان وکافر کے درمیان بھی ہوسکتا ہے، کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ولا یزالون مختلفین" (ہود:۱۱۸) (اور یہ لوگ برابر اختلاف کرتے رہیں گے)۔

اور خود مسلمانوں کے درمیان بھی ہوسکتا ہے، اور اس قسم کا کہ اس کے نتیجہ میں ان کے اندر مختلف گروہ وفرق نیز مذاہب ہوں۔

سابقہ تفصیل کی بنیاد پر میں کہتا ہوں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جو مطلق اختلاف سے گھبراتے اور تنگ دل ہوتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اختلاف کو کلیۃً رد وختم کر دیں، لیکن اپنے اس نظریہ وخیال کے پیچھے نادانستہ وغیر شعوری طور پر وہ لوگ خود اختلاف کو بڑھاتے اور اس کی آگ کو بھڑکاتے ہیں۔

اور اس کے برخلاف جو لوگ اس کی سعی کرتے ہیں کہ وہ اختلافات کو گوارا کریں اور

ان کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کریں۔ بشرطیکہ اختلاف شرعی حدود وقدروں کے مطابق ہو۔ اور وہ ایک واقعہ کی حیثیت سے اختلاف کو دیکھتے و مانتے ہیں وہ لوگ اختلاف کو حل کرنے میں پہلے فریق سے اچھے و بہتر ثابت ہوتے اور ان کا موقف و معاملہ اختلاف کے باب میں ان سے اچھا اور محفوظ و مامون ہوتا ہے۔

اختلافات میں کیا اور کس انداز کا موقف ہو؟ اس بابت دو اہم امور کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

(۲)

اختلاف کے علمی قواعد

اول: اس پہلو سے یہ نقطہ اہم وضروری ہے کہ ایک عالم کو ہمیشہ تحقیق وتدقیق، بحث وجستجو، دلائل وغیرہ میں غور وفکر کا حریص ہونا چاہیۓ، اس لئے کہ عالم متبوع ہوتا ہے (لوگ اس کو دیکھتے اور اس کے پیچھے چلتے ہیں)، اسی لئے کہا گیا ہے کہ عالم کے پھسلنے کی وجہ سے پورا عالم پھسلتا ہے، اس کی لغزش جاہل کی لغزش نہیں ہوتی کہ جو لپیٹ کر رکھ دی جاتی ہے اور اس کا کوئی تذکرہ وچرچا نہیں ہوتا۔

لہذا علماء، ارباب افتاء، طلبہ علم سب پر لازم ہے کہ اپنے اقوال وآراء میں دقت نظر کو اپنائیں اور دلائل میں خوب غور وفکر کریں، نیز تحقیق سے کام لیں اور بغیر اطمینان وسوچ سمجھے مسائل میں کوئی بات نہ کہا کریں۔

بعض طلبہ بعض مسائل میں حیرانی کا شکار ہو جاتے ہیں وہ براہ راست نشر کئے جانے والے کسی پروگرام میں، یا لوگوں کے سامنے خطاب میں، یا درس وغیرہ میں، یا کسی عام مجلس میں ہوتے ہیں، اور ان پر سوالات کی کثرت ہوتی ہے اور ان کے لئے یہ گراں ہوتا ہے کہ یہ کہیں: اللہ بہتر جانتا ہے، مجھ کو اس کا علم نہیں ہے، میں مسئلہ کی تحقیق کروں گا اس کے بعد بتاؤں گا، اور موقع ومحل سے وہ۔ اپنے حساب سے مناسب انداز میں۔ پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں اور اس میں یا تو ممانعت واحتیاط کی راہ اختیار کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ممانعت زیادہ مناسب وسمجھداری کی بات ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان سے ایسی چیزوں کی بابت سوال کیا جاتا

ہے جن کے جواز کا علماء کا فیصلہ ہوتا ہے لیکن جس سے سوال کیا جاتا ہے اس کو دلیل کا علم نہیں ہوتا یا نفس فتوی کا ہی علم نہیں ہوتا تو وہ کہتا ہے کہ اس کو ممنوع ہونا چاہئے اور پھر کبھی اس کو صراحتہ حرام کہتا ہے اور اس میں شدت کا مظاہرہ کرتا ہے اور بسا اوقات اپنی اس رائے کی بنیاد پر ایسی باتیں بھی کرتا ہے جو صحیح نہیں ہوتیں۔

مثلاً ایک آدمی دینی مسائل میں گفتگو کر رہا ہوتا ہے، اس سے سوال ہوتا ہے کہ جو آدمی وتر نہ پڑھتا ہو اس کا کیا حکم ہے تو وہ جلد بازی و جوش میں کہہ دیتا ہے کہ وتر کا ترک کرنا گمراہی ہے، اور جو وتر نہ پڑھے اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی، اور یہ بھی کہہ جاتا ہے کہ جو آدمی آج وتر چھوڑے گا وہ کل کو فرض نمازیں بھی چھوڑے گا۔

اس کے بعد اس مسئلہ کے ذیل میں مزید باتیں کہتا ہے جو اس مسئلہ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں، اور جب برملا — سب کے اور مجمع کے — سامنے اس قسم کی باتیں کہتا ہے تو وہ اس کا پابند ہو جاتا ہے، اب اس کو اپنی رائے و قول کے مؤیدات کی تلاش ہوتی ہے، اور پھر اس کو جب اہل کوفہ کا قول وجوب وتر کا ملتا ہے تو خوش ہو جاتا ہے اور تو اسی قول کو اپنا لیتا ہے۔

اسی طرح بعض دوسروں کا حال یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بعض ایسے اقوال کو اختیار کر لیتے ہیں جو تشدد پر مبنی ہوتے ہیں یا اجماع کے مخالف ہوتے ہیں۔

حالانکہ اس قسم کا آدمی — جس سے برملا مسائل پوچھے جاتے ہیں — اگر کچھ توقف سے کام لے، تو اس کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ کسی حرج و تنگی نیز حرمت و شدت احتیاط کے بغیر بھی اپنی اس مراد کو پالے اور پورا کر سکے کہ لوگ نیکیوں پر کاربند ہوں اور وہ لوگوں کو نیکی و طاعت پر آمادہ کرے۔

کچھ لوگ اس کے برعکس ہوتے ہیں کہ ایک آدمی کسی ٹی وی پروگرام یا لوگوں کے جم غفیر میں ہوتا ہے اور موقع و محل اس کا نہیں ہوتا کہ زیادہ سوچ سکے، غور و فکر اور دلائل سے کام لے سکے،

اس حال میں اس سے کوئی سوال کیا جاتا ہے تو وہ - برجستہ - اس کی حلت کا فتوی دیدیتا ہے حالانکہ وہ صراحتہً حرام ہوتا ہے، لیکن چونکہ غور وفکر کا موقع نہیں ہوتا اور نہ وہ اس کو اہمیت دیتا ہے تو وہ سوچ کر کچھ کہنے سے عاجز رہ جاتا ہے اور پھر اسی بات کو جو زبان سے نکل گئی وہ پکڑ لیتا ہے اور اس کے لئے گنجائش - دلائل و بنیادیں - تلاش کرتا ہے جبکہ اصل موقع سے اس کو کہنے میں اس کے لئے وسعت وگنجائش تھی۔

لہذا عالم وطالب علم کو تحقیق واطمینان، غور وفکر، نیز دلائل پر نظر وتلاش اور اہل علم سے مراجعت کی حرص واہتمام ہونا چاہئے اور اس کی کہ لوگوں سے اس زبان واسلوب میں بات کرے جس سے وہ مانوس ہوں، کیونکہ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ شرعی نقطہ نظر سے ان کا معاملہ واضح ہوتا ہے لیکن جواب دینے والے کو یہ سمجھنا چاہئے کہ آج ان چیزوں کو سننے ومعلوم کرنے والے بہت سے لوگ عوام میں سے ہوتے ہیں جو شرعی الفاظ، ان کے حقائق کو نہیں سمجھتے، نیز بہت سی چیزوں کے فرق کو نہیں جانتے اور نہ اس کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ ایسے مواقع میں امتیاز کرسکیں، اس کی وجہ سے بڑا اشتباہ وفساد پیدا ہوتا ہے۔

مثلاً عوام کسی عالم کا یہ فتوی سنتے ہیں کہ جو مسلمان ایسے ملک میں رہتا ہو جس میں اسلامی - غیر سودی - بینک نہ ہوں تو اپنا مال سودی بینک میں رکھ سکتا ہے اور اس پر جو مزید رقم ملتی ہے اس کو بھی لے سکتا ونکال سکتا ہے، اس کو نہ تو بینک کے لئے چھوڑے اور نہ ان ملکوں کی رفاہی انجمنوں واداروں کے لئے چھوڑے بلکہ ضروری ہے کہ اس کو بینک سے لے لے اور خود مالک بننے کے ارادے اور ذاتی استعمال کے لئے نہیں بلکہ اس لئے کہ اس کو حاصل کرنے کے بعد اس سے چھٹکارا حاصل کرلے گا۔

یہ فتوی آج کے فقہاء عام طور سے دے رہے ہیں لیکن اس فتوی کو سننے وجاننے والے بعض لوگ ایسے ہوسکتے ہیں کہ جو اس پر متنبہ ومتوجہ نہ ہوں کہ یہ فتوی اس علاقے کے لئے ہے

جس میں صرف سودی بینک پائے جاتے ہیں اور اسلامی بینک -جن میں بغیر سود کے پیسے رکھے جاسکتے ہیں وہ- ان میں پائے ہی نہیں جاتے۔

تو ایسا آدمی اس میں فرق سے واقف نہیں ہوتا تو فرق کرتا بھی نہیں، اسی طرح ایک فرق اور ہے اس سے بھی وہ ناواقف ہوتا ہے، وہ فرق یہ کہ زائد پیسہ ان بینکوں سے اس لئے نہیں لیا جاتا کہ اس کو اپنی ملکیت بنایا جائے بلکہ اس لئے لیا جاتا ہے تاکہ اس سے چھٹکارا حاصل کیا جائے، لہذا اگر کسی عامی سے یہ سنو تو تعجب نہ کرو۔ فلاں شیخ وعالم نے ربوی نفع کو جائز کہہ دیا ہے، جبکہ دونوں فتوؤں میں نمایاں وغیر مخفی فرق ہے۔

اس لئے طالب علم اور مفتی پر لازم ہے کہ وہ اپنے لفظ وعبارت میں وضاحت نیز وقت کا خیال رکھے اور اپنے فتوی سے پہلے تحریر میں کچھ تمہیدی ووضاحتی امور بھی رکھے ولکھے تاکہ فتوی حاصل کرنے والے اور اس سے واقف ہونے والے کی نفسیات وعقل پر اثر انداز ہوا جاسکے، اس کے بعد پھر سوال کردہ فتوی کو اس طرح ذکر کرے کہ اس میں کسی طرح کا التباس واشتباہ نہ ہو۔

دوم: کسی کے لئے خواہ وہ اہل علم میں سے کیوں نہ ہو یہ جائز نہیں کہ وہ کسی مسئلہ میں کسی مرجح شرعی کے بغیر ترجیح کی بات کرے، مثلاً کوئی ایک قول کو دوسرے کے مقابلہ میں محض اس وجہ سے ترجیح دے کہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے، اس لئے کہ فروعی مسائل میں علماء کے درمیان بہت اختلاف ہے، لیکن اختلاف کا پایا جانا یہ اس کی دلیل نہیں کہ اس کی وجہ سے کسی ایک قول کا اختیار کرنا یا اس کو ترجیح دینا درست ہو، کیونکہ اختلاف اس کی اجازت نہیں دیتا کہ علماء کے اقوال میں سے جس قول کو آدمی چاہے اختیار کرلے، ترجیح تو دلائل کی بنیاد پر اور صحیح شرعی امور وقرائن کی بنیاد پر ہوتی ہے۔

بعض لوگ بعض اقوال کو تشہی (خواہشات) کی بنیاد پر یا شخصی رغبت ودلچسپی کی بنیاد پر اپناتے ہیں یہ بھی جائز نہیں ہے، اس لئے کہ شریعت اور شریعت کا غیر جو آدمی کو ضائع وبرباد کرنے

والی چیز ہے، دونوں کے درمیان حد فاصل اور فرق کرنے والی چیز یہ ہے کہ شریعت وحی ہے اور حکم کو لازم کرنے والی چیز ہے، اور اس کے ماسوا جو ہے وہ سب ہوا وہوس ہے، اسی لئے اللہ تعالی نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا:

"ثم جعلناک علی شریعة من الأمر" (الجاثیہ:۱۸) (پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا)۔

لہذا محض جی چاہنے، اچھا لگنے کی بنیاد پر کسی رائے وقول وحکم کو اختیار نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ ضروری ہے کہ اختیار وترجیح شریعت کے قواعد ودلائل اور اس کے مقاصد پر مبنی ہو۔

سوم: اجتہادی مسائل میں اصل یہ ہے کہ علماء مسلمین کے درمیان اختلاف پر انکار ونکیر نہ کیا جائے اور ایک دوسرے کو معذور سمجھا جائے، نیز ایک دوسرے کی بات کو قبول کیا جائے یعنی ہر ایک کو اپنی بات کہنے کی گنجائش دی جائے اگرچہ اس کی موافقت نہ کی جائے، جب حق تعالی نے کسی مسئلہ میں قطعی دلیل نہ رکھی ہو تو کسی کے لئے اس میں حد سے تجاوز جائز نہیں ہے، ائمہ سلف اسی پر تھے، ان کی یہی شان تھی اور یہی طریقہ تھا، یحییٰ بن سعید انصاری فرمایا کرتے تھے:

اہل علم توسع والے لوگ ہوتے ہیں اور ارباب افتاء میں ہمیشہ اختلاف ہوتا رہا، ایک حلال اور دوسرا حرام کہتا رہا لیکن ایک دوسرے پر کسی نے عیب نہیں لگایا (ملاحظہ ہو: تذکرۃ الحفاظ ۱/۱۳۹)۔

سفیان ثوریؒ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

اہل علم نے برابر اس کا اشارہ کیا ہے کہ اجتہادی مسائل میں انکار نہیں کیا جاتا، یہ قاعدہ فی الجملہ صحیح ہے، اگرچہ ہر قاعدہ میں کچھ استثناءات ہوتے ہیں جیسا کہ معروف ہے، چنانچہ یہاں بھی کچھ مسائل ہیں جن کو اس قاعدہ سے مستثنی کیا جانا چاہئے، مثلاً:

وہ مسائل جن میں اختلاف بھلایا جا چکا، اب اس کی کوئی حیثیت -نفع وغیرہ- نہیں، اس میں قول مرجوح، متروک ہو چکا ہے، کوئی نہ اس کی موافقت کرتا ہے اور نہ اس پر

عمل کرتا ہے جیسے جنابت سے تیمم کے مسئلہ میں حضرت عمر وابن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول (یہ مسئلہ گذر چکا ہے)۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس قول سے صرف نظر لازم ہے، اور متعدد علماء سے ہم نے اجماع نقل کیا ہے کہ اس کو چھوڑ دیا گیا ہے، تو اب یہ ایک تاریخی قضیہ ومسئلہ ہے (شرعی مسئلہ نہیں)۔

- اسی طرح وہ مسائل جو صریح نص سے معارض ومخالف ہوں ان مسائل کے قائلین سے بحث کی جانی چاہئے اور ان سے مسئلہ کی نص کا اور اس کا تذکرہ کرنا چاہئے کہ ان کے لئے اس کا قائل ہونا درست نہیں ہے محض اس وجہ سے کہ یہ فلاں کا قول ہے، ہوسکتا ہے کہ اس فلاں نے کسی خاص ماحول وسیاق میں یہ بات کہی ہو یا اس وجہ سے کہ اس کے علم میں اس کی دلیل نہ رہی ہو یا کوئی دوسرا سبب رہا ہو۔

اس موقع سے ہمارے لئے یہ ذکر کرنا مناسب ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ ایک حدیث کو نقل کرتے تھے اور اس کے بعد وہ ان کے ذہن ویادداشت سے نکل جاتی تھی۔

لہذا ان اقوال کو چھوڑ دیا جائے جو بہت ضعیف ہیں اور پھر شدت ضعف کے ساتھ قرآن کریم یا سنت کی کسی نص سے معارض ومخالف ہوں، یا کسی اجماع صحیح کے خلاف ہوں یعنی ایسا اجماع کہ جس کو اجماع قطعی کہا جاسکتا ہے۔

اور اجماع قطعی سے ہماری مراد ایسا اجماع ہے جس کی نقل بغیر کسی نکیر کے تواتر سے ہو، یا کم از کم وہ خاص قوت رکھتا ہو، جس کی صورت یہ ہے کہ اہل علم کی ایک جماعت اس کو نقل کرتی ہو اور علمی کتابوں ومجموعوں میں اس اجماع کے خلاف کوئی بات یا کسی کا قول منقول نہ ہو۔

میں اس سے ان امور کو مراد نہیں لے رہا ہوں جن کو اجماع کہہ کر نقل کیا جاتا ہے، اور اس کے لئے اس کے بارے میں اچھی طرح تحقیق وتدقیق سے کام نہیں لیا جاتا، اس لئے کہ بعض علماء جس مسئلے میں کسی مخالف کا ان کو علم نہیں ہوتا اس کو اجماعی کہہ دیتے ہیں، اس قسم کا اجماع

ضعیف ہوتا ہے کیونکہ مخالف کا معلوم نہ ہونا اتفاق واجماع کا علم نہیں (کہا جا سکتا)۔

بعض لوگ ائمہ اربعہ کے اتفاق کو اجماع کہہ دیا کرتے ہیں جبکہ مدینہ کے فقہاء سبعہ کی رائے یا بہت سے صحابہ کی رائے ان کے خلاف ہوتی ہے، جیسا کہ کئی معروف ومشہور مسائل میں ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ- اگرچہ چند ہی مسائل میں ہے- کہ یہ اتفاق بعض نصوص کے خلاف ہوتا ہے۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک عالم اجماع کو نقل کرتا ہے، بعد کے مؤلفین اسی کو نقل کرتے رہتے ہیں حتی کہ اس نقل کی نسبت دسیوں علماء کی طرف کی جاتی ہے، جبکہ اکثر ایک دوسرے سے نقل کرنے والے ہوتے ہیں اور وہ خود مسئلہ کی تحقیق نہیں کرتے۔

مثلاً خمر (شراب) کی نجاست کا مسئلہ ہے، اس کے بارے میں مضبوط اختلاف ہے، چنانچہ بعض علماء متاخرین نے اس کی طہارت کو راجح قرار دیا ہے، اس لئے کہ نجاست پر کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ طہارت کے دلائل قوی ہیں جن میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اصل طہارت ہے اور یہ کہ شراب حرمت کے موقع سے مدینہ کی گلیوں میں بہائی گئی۔

ایسے ہی زخم سے بہنے والے خون کی طہارت کا مسئلہ ہے، ایک بڑی تعداد نے اس کی نجاست پر اجماع نقل کیا ہے جیسا کہ "بلوغ المرام" کی کتاب الطہارۃ پر اپنی شرح کے اندر میں نے ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو: بلوغ المرام کی شرح کتاب الطہارۃ ا/ ۳۹۴، ۴۰۰، ۴۶۲-۴۶۴، شرح العمدۃ لابن قدامہ)۔ اس وسیع نقل کے باوجود متقدمین ومتاخرین میں سے بہت سے حضرات نے اس کی طہارت کو ترجیح دی ہے، جس کے ان کے پاس دلائل ہیں، لہذا اس اجماع کے نقل میں اشکال ہے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ کچھ علمی وعملی مسائل میں قطعیت کے ساتھ اجماع ثابت ہے، اور اجماع فی الجملہ تمام ملتوں میں اور سب ہی جماعتوں کے نزدیک معتبر ہے۔

رہے وہ مسائل جن میں اہل علم کا اختلاف ہے، اور ان کے اندر ان کا اختلاف کافی معروف وعام ہے، اور اہل علم نے اس کو اپنی کتابوں میں ذکر ونقل کیا ہے، اور ہر قول کے معتبر دلائل ہیں، اور ان اختلافی اقوال میں بعض راجح اور بعض مرجوح ہیں، تو ایسے مسائل واختلافات میں علماء ایک دوسرے کو معذور سمجھتے ہیں (اور سمجھنا چاہیے)۔

علمی پہلو کی نسبت سے یہ تین نقاط قابل توجہ ہیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔

(۴)

اختلاف کے عملی قواعد

اول: عوام جو طالبان علم کے زمرہ و جماعت سے نہیں ہیں ان کو اختلافی مسائل واقوال کی ترجیح کے معاملہ میں نہیں پڑنا چاہئے۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"من حسن إسلام المرء تركه ما لا يعنيه" (احمد:۱۷۳۷، ترمذی:۲۳۱۸ واللفظ له عن الحسن بن علیؓ، ابن ماجہ:۳۹۷۶، ابن حبان:۲۲۹ عن ابی ہریرہؓ)۔

(آدمی کے اسلام کی خوبی ہے کہ وہ لایعنی کاموں وچیزوں میں نہ پڑے ان سے دور رہے)۔

اور حق سبحانہ وتعالی فرماتے ہیں:

"ولا تقف ما ليس لك به علم إن السمع والبصر والفؤاد كل أولئك كان عنه مسئولا" (الاسراء:۳۶) (اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر عمل درآمد مت کیا کرو کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب کی پوچھ ہوگی)۔

اس لئے انسان کو مناسب یہی ہے کہ جس چیز کا اس کو علم نہیں وہ اس کے درپے نہ ہو، اور ایک آدمی اگر کسی فن کا متخصص -کامل و ماہر- ہو تو ضروری نہیں کہ وہ ہر فن کا عالم ہو جائے، یا یہ کہ وہ شریعت کے احکام ومسائل کو بھی اچھی طرح سمجھ سکے۔

اس لئے کہ اہل علم کا معاملہ یہ ہے کہ اکثر ان کے اندر وسعت صدر اور وسعت نظر ہوتی

ہے جس کی وجہ سے وہ اختلاف کے آثار و معاملات میں تسامح و چشم پوشی سے کام لیتے ہیں، اسی لئے ان کو جب آپس میں ملتے دیکھو گے تو دیکھو گے کہ وہ ایک دوسرے سے سلام و مصافحہ کرتے ہیں، مسکراتے ہیں، تکریم و تعظیم کرتے ہیں، اور ان کے درمیان اچھے ہی معاملات ہوتے ہیں۔

لیکن انہیں اہل علم کے بہت سے ماننے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے اندر جہالت، عصبیت، خواہش نفس اور فرصت بھی ہوتی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے:

"لقد هاج الفراغ عليّ شغلاً"

(فراغت وفرصت نے میرے لئے مشغولیت فراہم کردی ہے)

وأسباب البلاء من الفراغ

(اور فراغت ہی کی وجہ سے میں مصیبتوں میں ہوں)

اگر نا اہل قسم کے لوگ علم وفتوی کے معاملہ میں دخل انداز نہ ہوتے تو یہ فی الجملہ خیر کا ہی معاملہ تھا، ابوداؤد نے "مراسیل" میں روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

میرا جی چاہتا ہے کہ سب لوگ اس علم میں دخل نہ دیتے، تو ابن عباسؓ نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین ایسا کیوں فرماتے ہیں؟ فرمایا: مجھ کو اندیشہ ہے کہ لوگ احمقانہ باتیں کریں گے۔

خلیفہ ملہمؒ نے سچ فرمایا کیونکہ زیادہ تر لوگوں کی بحث ومباحثہ، قیل وقال، نیز بے تکی باتیں اسی وجہ سے ہوتی ہیں کہ ہر ایک خود کو حق پر اور حق سمجھتا ہے، اس لئے کہ ہر ایک کے پاس علم تھوڑا ہوتا ہے اور اس کو غلط فہمی ہوتی ہے کہ خود کو صاحب علم سمجھتا ہے، جبکہ وہ کچھ نہیں ہوتا، لیکن اکثر لوگ اس قسم کی باتوں کو نہیں سمجھتے۔

دوم: انسانی سلوک میں شخصیت و معاملات کی نسبت سے احتیاط:

انسان کو بہت سے اقوال و اختلافات ملتے ہیں، ایک آدمی اباحت کی بات، دوسرا

ممانعت کی اور تیسرا کراہت کی کہتا ہے، جبکہ چوتھا مستحب کہتا ہے، بلکہ بات واجب کہنے تک بھی پہنچ جاتی ہے اور حرام تک بھی، ایسی صورت میں آدمی کے لئے فی الجملہ احتیاط کو اپنانے واختیار کرنے کی گنجائش رہتی ہے، ایسا کرنا ضروری نہیں ہوتا۔

البتہ ہم یہ کہتے ہیں کہ آدمی اپنی ذات کے حق میں تو احوط (انتہائی احتیاط والی بات) کو ہی اختیار کرے کہ جب کسی مسئلہ میں قوی اختلاف ملے، لیکن ایسا کہ دونوں طرف سے توازن ہو، اور آدمی اس کو چھوڑ سکتا ہو، تو ایسی صورت میں ورع کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے دین کی احتیاط کے لئے اس کو عمل میں لائے، حضرت نعمان بن بشیرؓ کی متفق علیہ حدیث میں ہے:

"فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه ولعرضه" (بخاری:۵۲، مسلم:۱۵۹۹ واللفظ لہ)۔

(جو آدمی شبہات سے بچتا ہے وہ اپنے دین وآبرو کو محفوظ کر لیتا ہے)۔

اور جب کسی مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہو کہ کوئی واجب، دوسرا مستحب اور تیسرا مباح کہے تو احتیاط اس میں ہے کہ اس کو کیا جائے، اس لئے کہ جیسے ورع احتیاط یہ ہے کہ ان مشتبہات سے بچا جائے جس میں کراہت وحرمت کا تردد ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی ورع ہے کہ اس مشتبہ کو کیا جائے جو وجوب وعدم وجوب کے درمیان متردد ہو۔

بعض لوگ ورع کا تصور صرف نہ کرنے وچھوڑنے میں رکھتے ہیں اور اس سے غفلت برتتے ہیں کہ یہ بھی ورع ہے کہ جب کوئی کام وجوب واستحباب کے درمیان متردد ہو تو اس کو عمل میں لایا جائے۔

لیکن اس ورع میں چند امور کا لحاظ کیا جانا چاہئے:

اول: ورع واحتیاط ایک شخصی چیز ہے جس کو آدمی خود (اور اپنے لئے) کرتا ہے، لہذا اس کو دوسرے پر نہیں لازم کرنا چاہئے خواہ دوسرا اپنا بہت قریبی ہو، اس لئے کہ آدمی اپنی بیوی واولاد کو ایسی چیز کا مکلف نہیں بنا سکتا، ہاں نصیحت کر سکتا ہے، تجویز کر سکتا ہے لیکن لازم ومجبور

کر دے یہ نہیں، کیونکہ اس میں لوگوں کے لئے مشقت ہے۔

دوم: بعض مسائل میں ورع کا معاملہ نہیں ہوتا، اور نہ ہوسکتا ہے اس لئے کہ وہاں وجوب وحرمت کا تردد ہوتا ہے، وہاں ایک کے مذہب پر ورع اختیار کرنے میں دوسرے کے مذہب کی رو سے محذور لازم آئے گا مثلاً جہری نمازوں میں سورہ فاتحہ کی قراءت، بعض لوگ اس کو ضروری کہتے ہیں اس لئے کہ حدیث ہے:

"لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب" (بخاری:۷۵۶، مسلم: ۳۹۴ عن عبادۃ بن صامتؓ) (جو آدمی سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی)۔

اور بعض اس کو حرام کہتے ہیں اگر امام اس کے لئے خاموشی اختیار نہ کرے، اس لئے کہ ارشاد باری ہے:

"إذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا" (الاعراف:۲۰۴) (اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو)۔

ایسی صورت حال میں اجتہاد ضروری ہے، خواہ دلائل کا جائزہ لیا جائے جیسا کہ طلبہ علم وعلماء کی شان وحکم ہے یا ان لوگوں کی اتباع کی جائے جن کے دین وعلم پر اعتماد کیا جاتا ہے، یہ ان لوگوں کے حق میں ہے جو عوام ومقلدین میں سے ہوتے ہیں اور خود دلائل کو دیکھنے وسمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

سوم: اہل علم کے اقوال سے متعلق احتیاط دلیل شرعی نہیں ہے، اس لئے کہ بہت سے مسائل میں اختلاف ہے، اب اگر کوئی آدمی ہر اختلافی مسئلہ میں یہ روش اختیار کرے کہ میں اس کو نہیں کروں گا تو اس کو اطلاقاً مشروع ودرست نہیں کہا جائے گا، بلکہ اس کے لئے جس قول کا رجحان ظاہر ہو اس پر عمل کرے اور اس میں اس پر کوئی ملامت نہ ہوگی خواہ رجحان کسی آیت یا روایت کی بنا پر ہو یا عقلی دلیل کی قوت وغیرہ کی بنا پر۔

اور ورع واحتیاط سے متعلق تینوں ملاحظات کا خلاصہ وحاصل یہ ہے کہ تم کہو:
پہلی بات یہ ہے کہ احتیاط کو آدمی اپنی ذات کے ساتھ شخصی طور پر خاص رکھے، اور دوسروں پر اس کو نہ تھوپے۔

دوسری بات یہ کہ بعض مسائل میں ورع واحتیاط کا معاملہ یہ نہیں ہوتا کہ ان کو کلیۃً ترک کردیا جائے بلکہ اس کا یا اس کا کسی ایک پر عمل کا ہوتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ فقہاء کے اختلاف سے بچنے پر عمل، اطلاقاً نہیں ہے بلکہ اگر آدمی کسی قول کو راجح وظاہر پائے تو وہ اس پر بلا کسی کراہت کے عمل کرے گا اور یہ نہ کہے کہ میں اس کو اختلاف سے بچنے کے لئے نہیں کرتا، اس لئے کہ آدمی مکمل طور پر علماء کے اختلاف سے باہر نہیں ہوسکتا۔

بہر حال اس طرح آدمی اختلافی مسائل میں احتیاط وورع کو اختیار کرسکتا ہے۔

سوم: اہل علم کے ساتھ حسن ظن کا معاملہ کرنا چاہئے، خواہ بعض مسائل میں ان سے اختلاف کیوں نہ کیا جائے، کیونکہ اصل یہی ہے کہ ان کے حق میں حسن ظن رکھا جائے، اور کسی عالم کے کسی قول کے حق میں یہ نہ کہا جائے کہ اس نے کسی دلیل، یا کسی نص کی مخالفت کا ارادہ کیا ہے، یا حجۃ شرعیہ سے نکلنے کا ارادہ کیا ہے، بلکہ اس کے قول کو اس پر محمول کیا جائے کہ دلیل اس کو نہیں پہنچی، یا دلیل کے خلاف کوئی بات اس کو قوی معلوم ہوئی یا اس نے خاص حالات، ماحول وپس منظر کا لحاظ کیا ہے، یا نص کے ورود ونزول کے سبب یا واقع اور اس کے متعلقات کا لحاظ کیا ہے (ملاحظہ ہو قریب میں گذری تفصیل)۔

جبکہ اس عالم کے پاس ایسی بات ہوسکتی ہے جو میرے پاس نہ ہو، اس لئے جب میرا کسی عالم سے اختلاف ہو تو مجھ کو یہ کہنا وسوچنا چاہئے کہ درستگی وصحت اس کے ساتھ بھی ہوسکتی ہے، اس لئے کہ اس نے ایسے امور کو سامنے رکھا ودیکھا ہے جن تک میں نہیں پہنچ سکا، لیکن مجھے تو

اسی پر عمل کرتا ہے جو میرا اجتہاد ہے اور وہ اپنے اجتہاد پر عمل کا مکلف و پابند ہے۔

"لا يكلف الله نفساً إلا وسعها" (البقرہ:۲۸۶)۔

ہر عالم کے کچھ ایسے مسائل ہوتے ہیں جن کے بارے میں اس کی انفرادی رائے ہوتی ہے، صحابہؓ سے لے کر ائمہ اربعہؒ پھر ان کے کبار اصحاب واتباع اور فقہاء ومفتیین ومجتہدین وغیرہ سب کا یہی معاملہ ہے اور سب کے کچھ نہ کچھ تفردات ہیں، مذاہب کے بھی اور افراد کے بھی۔

اس لئے ہمارے لئے یہ مناسب نہیں کہ ہم ائمہ کو برا بھلا کہیں بلکہ ہم کو ان کے ساتھ حسن ظن رکھنا چاہئے بالخصوص جبکہ ان کا معاملہ یہ ہو کہ وہ علم شرعی اور ورع وتقوی میں بڑے مقام ومرتبہ کے حامل تھے اور مناسب یہی ہے کہ ہمارا سینہ وہمارا دل وسیع وکشادہ ہو، ہم ان کے لئے عذر کے قائل ہوں، حسن ظن رکھتے ہوں اور حتی الامکان ان کے اقوال کے لئے اچھے محمل تجویز کریں۔

چہارم: تقلید اور تقلید غیر کی بات بلا دلیل ماننے کا نام ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کسی کو یہ کہتے سنے کہ یہ حلال ہے، یہ حرام ہے، یہ مکروہ ہے، یہ کرنا واجب ہے، پھر اس کی بات کو مان کر اس پر عمل کرے اور اس کی دلیل کو سمجھے بغیر اس کے کہنے پر چلے۔

تقلید بعض اوقات ضروری ہوتی ہے، اس لئے کہ بہت سے عوام ہیں کہ نہ ان کے پاس سمجھ ہے اور نہ ہی علوم شرعیہ سے واقفیت، تو ایسے لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کو ایسے حضرات کی تقلید ہی کرنی ہے جن کے علم ودین پر ان کو اعتماد ہو۔

اور اصل یہ ہے کہ تقلید نہ کرکے براہ راست کتاب وسنت سے اور اقوال ائمہ سے استفادہ کیا جائے، لیکن ایسے لوگ کتنے ہیں کہ جو خود احکام شرعیہ کے استنباط کی، دلائل کو سمجھنے اور ان کے درمیان جمع وتطبیق اور اس سلسلہ کی مشکلات کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، ایسے

لوگ بہت ہی کم ہیں۔

بہر حال بعض حالات میں تقلید ضروری ہوتی ہے، اسی لئے ابن قدامہؒ نے فرمایا ہے:

تمام اصولیین کا اجماع ہے کہ عامی آدمی کا مذہب اس کے مفتی کا مذہب ہے۔

اور عامی پر لازم ہے کہ وہ ایسے آدمی کا انتخاب کرے جس کی اس کو تقلید کرنی ہے، اور یہ اس کے نیز اسؒ کے رب کے درمیان کا مسئلہ ہے، اس لئے کہ یہ دین کا اور دین پر عمل کا مسئلہ ہے، لہٰذا اس کے لئے اس کا انتخاب کیا جائے گا جس کے متعلق یہ عقیدہ ہو کہ اس کے پاس کافی علم ہے اور جس کے دین ورع وتقوی پر اعتماد ہو۔

بہت سے محققین اہل علم نے تاکیداً تقلید سے منع کیا ہے اور اس کی مذمت کی ہے، اور اس بارے میں شدت برتی ہے جیسے ابن القیم، اعلام الموقعین میں نیز شوکانی ورشید رضا (ملاحظہ ہو: اعلام الموقعین ۲/۱۸۷ و مابعد، ارشاد الفحول: ۲۴۶-۲۴۹، مجلۃ المنار کے متعدد مضامین بعنوان مناظرۃ بین مقلد وصاحب حجۃ، والمحاورات بین المصلح والمقلد)۔

البتہ ہم یہ کہیں گے کہ ہم ان باتوں کو اصالۃً تسلیم کرتے ہیں جن کا انہوں نے تذکرہ کیا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہیں گے کہ ہم کو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ تقلید کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس کو کسی تجویز یا حکم شرعی کے ذریعہ ختم کر دیا جائے حتی کہ جن لوگوں نے ترک تقلید کا اظہار واعلان کیا اور اس کی مذمت کی ان میں بہت سے لوگ تقلید سے بچ نہیں سکے، اگر چہ انہوں نے تقلید کو یوں چھوڑا ہو کہ اپنے استاذ شیخ کی تقلید نہیں کی، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے غیر شعوری طور پر اپنے شیخ کی بہت سے مسائل میں تقلید کی ہے، اور تقلید کو چھوڑنے اور دلیل پر عمل کرنے کی دعوت کے ساتھ انہوں نے اپنے شیخ کے مذہب کی تقویت وتائید کی ہے، اور شیخ کے مذہب پر ان کا عمل اور اس کی تائید ان کی طرف سے شیخ کی تقلید، ان سے تاثر اور استدلال میں شیخ کے طریقہ کار سے تاثر کی بنا پر ہی ہے، اس بنیاد پر نہیں کہ انہوں نے دلائل کے حق میں خود اجتہاد کیا ہے۔

پھر ایک دوسرا پہلو بھی ہے وہ یہ کہ تقلید کی بہت سی شکلیں اور صورتیں ہیں، بات صرف

یہ نہیں کہ کسی فقیہ کو کوئی بات کہتے یا فتوی دیتے سنا جائے اور کہا جائے کہ اس فقیہ کی بات کو کتاب وسنت واقوال علماء پر پیش کیے بغیر مت مانو، یہ تقلید کی ایک شکل ہے۔

اس کے علاوہ بھی تقلید کی لامتناہی شکلیں ہیں، انسان کبھی اپنے معاشرہ کی، اور کبھی کسی آدمی، کسی مذہب کی حتی کہ کبھی خود اپنی ذات کی بھی تقلید کرتا ہے، اسی لئے حضرت عمرؓ نے جب فرائض کے ایک مسئلہ میں کچھ فتوی دیا اور اس کے کچھ وقفہ بعد دوسرا فتوی دیا اور ان سے کہا گیا: امیرالمومنین! آپ نے تو ایسا ایسا کہا تھا، تو انہوں نے اپنا یہ مشہور جملہ کہا:

"ذلک علی ما قضینا وھذا علی ما نقضی" (ابن ابی شیبہ: ۳۱۰۹۷)۔

وہ اس بنیاد پر تھا جو ہم نے اس وقت فیصلہ کیا تھا اور اس پر اب ہم فیصلہ کریں گے، وہ مسئلہ حضرت عمرؓ کی اس نظر پر مبنی تھا جو اس وقت ان سے ممکن ہوئی، اور بعد میں اسی مسئلہ میں ان کی رائے بدل گئی اور نئی بات سمجھ میں آئی تو یہ فرمایا۔

تقلید کی شکلیں نفوس بشریہ کے اندر رچی بسی ہیں، بہت سے لوگ تقلید کے نام سے کسی مذہب فقہ، یا کسی امام یا فلاں وفلاں کی تقلید سے تو محفوظ ہوتے ہیں لیکن دوسری قسم کی بہت سی تقلید میں گھرے ومقید ہوتے ہیں اور ان سے وہ الگ نہیں ہوسکتے، بہت سے طلبہ علم تقلید سے ممانعت یا کسی معین مذہب کی پابندی سے ممانعت کو بیان کرتے ہیں تو وہ دوسروں کے اقوال ہی کو نقل کرتے ہیں اور وہ خود اس درجہ کو نہیں پہنچتے کہ مسئلہ میں خود اپنی فہم اور ادراک وتحقیق کی بنیاد پر کوئی بات کہے، اور مسئلہ میں خود ان کا ذاتی کوئی واضح ومکمل تصور وخیال ہوتا۔

اور فقہ وعلم کی ایسی پختگی کہ امت عمومی طور پر اس خاص درجہ ومرتبہ تک پہنچ جائے کہ جس میں تقلید کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کے لئے امت کو ایک وقت درکار ہے۔

اور عوام کی زیادہ تر تعداد ایسی ہے کہ ان کے لئے اس قسم کی ترقی دشوار ہے، حضرت عمرؓ نے -جیسا کہ صحیح مسلم میں آیا ہے- جب جابیہ میں خطبہ دیا اور اس کے اندر مختلف مسائل پر گفتگو

فرمائی جس میں یہ بھی تھا کہ میرے نزدیک میرے بعد کلالہ سے زیادہ اہم کوئی مسئلہ نہیں ہے، میں نے کلالہ کی بابت نبی اکرم ﷺ سے جتنا رجوع کیا کسی مسئلہ (کے سمجھنے) کے لئے نہیں کیا، اور آپ نے اس مسئلہ کی وجہ سے مجھ سے جیسی سخت بات فرمائی کسی دوسرے امر سے متعلق نہیں فرمائی حتی کہ اپنی انگلیوں سے میرے سینے میں ٹھوکر ماری اور فرمایا:

"یا عمر ألا تکفیک آیة الصیف التی فی آخر سورة النساء؟" (اے عمر کیا تم کو سورہ نساء کے آخر کی آیت صیف کافی نہیں ہے)۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا:

اگر میں زندہ رہا تو اس کی بابت ایسا فیصلہ کروں گا کہ اس کے مطابق ہر آدمی فیصلہ کرے گا خواہ قرآن کو پڑھا ہو یا نہ پڑھا ہو (صحیح مسلم: ۱۶۱۷)۔

حضرت عمرؓ نے ایک مسئلہ کی طرف اشارہ فرمایا وہ یہ کہ علم شرعی کو پیش کرنے اور اس کو عوام کے لئے آسان کرنے کی مختلف شکلیں وتدبیریں ہوسکتی ہیں اور اس کے لئے کچھ بنیادیں اور آسان قواعد بنائے جاسکتے ہیں بالخصوص اس زمانے میں جس میں باہمی ربط کے ذرائع ووسائل بہت اور آسان ہوگئے ہیں اور اس میں لوگوں کے لئے علم کے خزانے کھول دیئے گئے ہیں، پڑھے لکھے لوگ بہت ہوگئے ہیں اور نصوص شرعیہ کو سمجھنے کے لئے امت کے علمی معیار کو بلند کرنا ممکن ہوگیا ہے۔

(۴)

اختلاف محمود واختلاف مذموم

شریعت کی ہدایات وتعلیمات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تفرق اور اختلاف کے درمیان فرق ہے، اور یہ کہ تفرق تو مذموم ہے، اور مطلقاً یہ مذمت کی جگہ میں ہی بولا جاتا ہے اور مذمت کے موقع میں ہی پایا جاتا ہے (کیونکہ تفرق کا مفہوم ہے گروہ بندی و جماعت بندی) جبکہ اختلاف کا یہ معاملہ نہیں ہے، اختلاف مذمت کے مقابلہ میں بھی بولا جاتا ہے اور عذر وعدم مواخذہ کے محل میں بھی، اور کبھی کبھی یہ ممدوح بھی ہوتا ہے۔

اور اختلاف سے مقصود رائے کا اختلاف یا فہم کا اختلاف ہے کہ ایک آدمی ایک حکم سمجھتا ہے دوسرا اس سے مختلف حکم سمجھتا ہے، اسی طرح عمل میں بھی اختلاف ہوا کرتا ہے کہ ایک آدمی ایک عمل کرتا ہے اور دوسرا دوسرا عمل کرتا ہے۔

لیکن تفرق - یہ ہے کہ لوگ گروہوں میں بٹ جائیں اور تقسیم ہو جائیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے سابقہ حدیث میں فرمایا ہے:

"ستفترق هذه الأمة على ثلاث وسبعين فرقة كلها فى النار إلا واحدة" (تخریج گذر چکی ہے)۔

(یہ امت آئندہ تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی، اور سب جہنم میں جائیں گے، بجز ایک کے)۔

تفرق مذموم ہے، اس لئے آپ نے "فرق" (گروہوں) کا تذکرہ فرمایا ہے۔

قرآن کریم میں حق سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

"ولا تکونوا کالذین تفرقوا" (آل عمران:۱۰۵) (اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے باہم تفریق کر لی)۔

اس آیت میں تفرق (گروہ بندی) کی ممانعت کی طرف اشارہ ہے، اور اختلاف کی بابت حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"واختلفوا من بعد ما جاء هم البینات" (آل عمران:۱۰۵) (انہوں نے باہم اختلاف کیا ان کے پاس واضح احکام پہنچنے کے بعد)۔

اس آیت میں اشارہ ہے کہ اختلاف محمود و مذموم دونوں ہو سکتا ہے، یا کم از کم اس کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے حق میں بعض لوگ معذور اور بعض بے عذر ہوتے ہیں۔

یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے، اختلاف اگر صحیح بنیادوں پر قائم ہو تو وہ یا تو محمود ہوتا ہے یا کم از کم اختلاف کرنے والا معذور ہوتا ہے، اسی لئے حضرت عمرو بن عاصؓ کی حدیث -مرفوع- میں آیا ہے:

"إذا حكم الحاكم فاجتهد ثم أصاب فله أجران وإذا حكم فاجتهد ثم أخطأ فله أجر" (بخاری:۷۳۵۲ واللفظ لہ، مسلم:۱۷۱۶)۔

(جب حاکم کوئی فیصلہ کرے، اور اجتہاد کر کے صحیح فیصلہ کرے، تو اس کو دو اجر ملتے ہیں، اور جب فیصلہ کے لئے اجتہاد کرے اور صحیح فیصلہ نہ کر سکے بلکہ چوک جائے، تو اس کے لئے ایک اجر ہوتا ہے)۔

دیکھو کہ نبی اکرم ﷺ نے خطأ کا تذکرہ کیا اور اس کے ساتھ اور اس کے باوجود اس کے لئے ایک اجر کا تذکرہ فرمایا جو اجتہاد کا اجر ہے۔

تو یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت ہے کہ ایسے شخص کے لئے بھی اجر رکھا گیا، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایک آدمی جب اپنی وسعت و صلاحیت اجتہاد میں صرف کرے اور وہ مسئلہ

زیر بحث میں اجتہاد کی اہلیت بھی رکھتا ہو تو اس کے لئے دو اجر ہیں اگر صحیح فیصلہ تک پہنچا، ورنہ تو ایک اجر اس کے لئے ہے ہی، یہ اس لئے ہے کہ آدمی کو۔ (بشرط اہلیت)۔ اجتہاد پر آمادہ کیا جائے خواہ اس سے غلطی ہی ہو جائے، اس لئے کہ اجر کا تو ہر ایک طالب ہے لہذا آدمی ایک اجر یا دو اجر پائے گا جبکہ اپنی وسعت بھر کوشش کرے گا اور تعصب و ہوائے نفس کے تحت غلطی کا ارتکاب نہیں کرے گا۔

اختلاف محمود کے قبیل سے وہ اختلاف بھی ہے جس کو علماء ''اختلاف تنوع'' کہتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ امت ہر خیر سے کچھ نہ کچھ حصہ اپنائے ہوئے ہے، چنانچہ کچھ لوگ اجتہاد میں مشغول ہیں، کچھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں، اسی طرح کچھ لوگ آپسی معاملات اور خاندانی وگھریلو مشکلات کے حل میں لگے ہیں اور کچھ دوسرے مظلوموں کی مدد اور ضرورت مندوں کے تعاون میں مصروف ہیں، کچھ لوگ دینی تعلیم کے دینے میں یا مساجد کی تعمیر میں ہیں، اور کچھ دوسرے کتابوں کے لکھنے میں لگے ہیں، اور کچھ اللہ کے بندے شریعت کی حمایت وحفاظت، شبہات کے ردوحل اور ربانی وشرعی حجتوں ودلائل کے بیان کرنے میں مشغول ہیں، اور اسی طرح مزید شکلیں ہیں جن کو اللہ ہی جانتا ہے، یہ مشغولیتوں کا اختلاف اختلاف تنوع ہے، اور معاشرہ کے لئے یہ تنوع ضروری ہے، جس کا تعلق علمی میدان وجدوجہد سے ہے۔

علمی حدود میں ان سنتوں کا بھی اختلاف ہے جن کی بابت روایات میں متعدد الفاظ وصیغ آئے ہیں، جیسے آغاز نماز کی دعا کے مختلف الفاظ، تشہد کے مختلف الفاظ، رات کی نماز کی کیفیت، کہ ائمہ نے اس کی دس سے زیادہ کیفیات کا تذکرہ کیا ہے، اسی طرح صلاۃ الخوف کے بارے میں چھ سے زیادہ صورتوں کا بلکہ بعض علماء کے کہنے کے مطابق ۱۴ تک کا تذکرہ ملتا ہے، اسی طرح بعض عبادات کی مختلف سنتیں ہیں، ان میں سے ہر سنت کو اور کسی کسی سنت کو اختیار کرنا اختلاف تنوع اور اختلاف محمود ہے۔

ایسے ہی وہ مسائل ہیں جن کے بارے میں کوئی واضح نص نہیں ہے، اوران کے بارے میں اہل علم سلف وخلف نے اجتہاد کیا ہے اور پھر اختلاف کیا ہے اور صورت یہ ہے کہ کسی کو قطعی طور پر صائب یا خطا کار نہیں کہا جا سکتا، اس قسم کی صورت حال صحابہؓ کے ساتھ بھی پیش آئی ہے، اسی لئے بعض حضرات نے کہا ہے: سب کے سب مصیب (صائب) ہیں۔

اوراس جملہ کے دو معنی ہو سکتے ہیں:

اول یہ کہ ہر ایک نفس مسئلہ میں حق کو پانے والا اور حق پر عمل کرنے والا ہے۔

دوم یہ کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اجتہاد میں مصیب وصائب ہے، اس لئے کہ اسکو ایک یا دو اجر ملتا ہے، لیکن جمہور کے نزدیک ان میں سے مصیب ایک ہی ہے، (جس کو دو اجر ملے گا) اور دوسرے کو ایک اجر ملے گا یہ اپنے اجتہاد میں مصیب ہے، ضروری نہیں کہ نتیجہ میں بھی صائب ہو، بس اس کا طریقہ کار صحیح ہے، رہا نتیجہ تو صحیح بھی ہو سکتا ہے (اور غلط بھی) اور ایسی صورت حال میں اس کی تعیین نہیں کی جا سکتی اور نہ لازم ہے کہ واقعتاً کون مصیب وصائب ہے۔

یہ اختلاف بھی ایسا ہے کہ اس کو ہم اختلاف تنوع مان سکتے ہیں بشرطیکہ شرعی ضوابط کے مطابق ہو، اسی لئے اہل علم کی ایک جماعت نے صراحت کی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف رحمت ہے، جیسا کہ ابن قدامہ نے ''اللمعۃ'' میں ذکر کیا ہے، اور فرمایا ہے:

''صحابہ کا اختلاف رحمت واسعہ اور ان کا اتفاق حجت قاطعہ ہے'' (لمعۃ الاعتقاد ر ۳۵)۔

اس بابت ایک کتاب بھی لکھی گئی ہے، ''رحمة الأمة باختلاف الأئمة''۔

اگرچہ حدیث ''اختلاف أمتي رحمة'' (ملاحظہ ہو: المقاصد الحسنہ للسخاوی: ۳۹، الاسرار المرفوعہ ر ۱۷، کشف الخفاء للعجلونی: ۱۵۳) (میری امت کا اختلاف رحمت ہے) جس پر اس کتاب کی بنا وبنیاد ہے، اس کی کوئی سند نہیں ہے، لیکن امت کے اختلاف کا ایک حصہ رحمت ہے جو اختلاف تنوع کے تحت آتا ہے۔

رہی اختلاف کی دوسری قسم تو علماء اس کو "اختلاف تضاد" کہتے ہیں یعنی ایسا اختلاف جس میں دو مختلف قولوں کو جمع نہیں کیا جاسکتا۔

- اب سوال یہ ہے کہ اختلاف تضاد محمود ہے یا مذموم؟

- اقرب یہ ہے کہ اختلاف تضاد میں تفصیل ہے۔

- اگر اختلاف تضاد ایسے مسئلہ میں ہو کہ جس میں اختلاف جائز ہے اس طور پر کہ وہ کسی حجت شرعیہ پر مبنی ہو، اور امت نے اس مسئلہ میں پہلے بھی اختلاف کیا ہو، اور یہ اختلاف مسئلہ میں پوری وسعت وصلاحیت کے استعمال پر مبنی ہو، اور اس کے نتیجہ میں تفرق واختراق (گروہ بندی) کی نوبت نہ آئے، تو یہ محمود ہے یا کم از کم یہ کہ مذموم نہیں ہے۔

اور اگر ہم اس کو تقدیری وتکوینی پہلو سے دیکھیں اور اس پہلو سے کہ اختلاف تو ضروری ہے، اس سے مفر نہیں ہے تو ہم کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ اس قسم کے اختلاف کے تحت کیا مصالح، کیا وسعت اور کیسی عظیم ربانی حکمت ہے۔ جو بہت سی مخلوق کا احاطہ کئے ہوئے، اگر چہ خود مخلوق ایک دوسرے کے لئے وسعت نہیں رکھتی۔

لیکن اگر اختلاف تضاد، ہوائے نفس، زور وزبردستی پر مبنی ہو، یا گروہ بندی نیز دلوں میں اختلاف ودوری باہم تنافر کا سبب ہو تو مذموم ہے اور جو چیز ایسے اختلاف کا ذریعہ بنے وہ بھی مذموم ہے۔

اسی لئے جب حج میں حضرت عثمانؓ نے چار رکعت والی نماز کو چار رکعت ہی ادا کیا اور حضرت ابن مسعودؓ سے۔ جو اس حج میں موجود تھے۔ اس کا تذکرہ کیا گیا تو انہوں نے "إنا لله وإنا إليه راجعون" پڑھتے ہوئے فرمایا:

میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ منی میں دو رکعتیں ادا کیں، اور میں نے ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ منی میں دو رکعتیں ادا کیں، اور میں نے عمر بن خطابؓ کے ساتھ منی میں

دو رکعتیں ادا کیں اور کاش کہ چار کی جگہ میری دو رکعتیں مقبول ہو جاتیں (بخاری: ۱۰۸۴، مسلم: ۶۹۵ واللفظ لہ)۔

لیکن اس کے باوجود انہوں نے حضرت عثمانؓ کے پیچھے نماز پڑھی، اور جب ان سے اس بابت عرض کیا گیا تو فرمایا:

"الخلاف شر" (عبدالرزاق فی مصنفہ: ۴۲۶۹، ابوداؤد: ۱۹۶۰، بیہقی ۳/ ۱۴۳) (اختلاف بری بات ہے)۔

تو دیکھو کہ حضرت ابن مسعودؓ نے حضرت عثمانؓ کے حق میں پیشرو لوگوں سے ان کی مخالفت کے لئے منی میں چار رکعتیں ادا کرنے کے لئے عذر مانا، جو بھی مانا ہو، جیسا کہ ابن عربی نے "العواصم من القواصم" میں ذکر کیا ہے۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک اجتہادی قول مرجوح ہوتا ہے لیکن وہ تفرق - انتشار وگروہ بندی - کا باعث نہیں بنتا، حضرت ابن مسعودؓ نے حضرت عثمانؓ کے پیچھے نماز پڑھی، اور سلف باہمی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے رہے مثلاً حجامہ (پچھنا لگوانے) وغیرہ کی وجہ سے وضو کے ٹوٹنے کا مسئلہ، ایسے ہی ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھی گئی جبکہ امام نے بسم اللہ بلند آواز سے نہیں کہا یا سرے سے نہیں پڑھا، اس لئے کہ بلند آواز سے بسم اللہ کہنے کا مسئلہ اہم نہیں ہے کیونکہ بعض سلف سورہ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے اور کہتے ہی نہیں تھے، جبکہ کچھ لوگ اس کو سورہ فاتحہ کی ایک آیت سمجھتے ہیں، اس لئے ان کے نزدیک بسم اللہ کا نہ پڑھنا قرآن کریم کی ایک آیت کا نہ پڑھنا ہے، اس کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے رہے، حالانکہ حکم یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کی ایک آیت کا چھوڑ دینا سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کے درجہ میں ہے، لیکن نماز پڑھنے والوں نے مقتدی کے اجتہاد کو نہیں دیکھا بلکہ امام کے اجتہاد پر مسئلہ کو رکھا، کیونکہ اس میں تو اختلاف ہے اور صحابہ سے منقول ہے کہ بسم اللہ پڑھیں نہ پڑھیں، اور جہراً

پڑھیں یا سرا، لیکن اس میں اختلاف نہیں ہے کہ بسم اللہ قرآن کریم میں ہے اور اس کا حصہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"إنه من سليمان وإنه بسم الله الرحمن الرحيم" (النمل: ۳۰) (یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور اس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے)۔

حاصل یہ کہ اختلاف تضاد کبھی محمود ہوتا ہے اور کبھی مذموم بھی ہوتا ہے، محمود اسی وقت ہوتا ہے جبکہ ان مسائل میں ہو جن میں اختلاف (واجتہاد) کی گنجائش ہے، اور اس اختلاف کے محمود ہونے کا راز یہ ہے کہ امت کے حق میں ایسے اختلاف کے اچھے آثار ظاہر ونمایاں ہوتے ہیں، مثلاً:

اول: پوری امت کو ایک رائے پر جمع نہیں کیا جا سکتا، ایک آدمی ایک رائے اور دوسرا اسی مسئلہ میں دوسری رائے رکھتا ہے، اور تقلید کرنے والوں میں ایک کسی کی، دوسرا کسی اور کی تقلید کرتا ہے، اور یہ بندوں میں اللہ کا دستور ونظام رہا ہے۔

دوم: اس چیز نے بہت سی عقلوں کو مہمیز لگائی ہے کیونکہ اگر سارے لوگوں کو ایک ہی رائے پر جمع رکھا جاتا تو لوگوں میں گمنامی، فکروں میں جمود وپژمردگی آتی، اور ہوائیں بارش کا سبب- اسی وقت بنتی ہیں جبکہ ان میں باہم ٹکراؤ پیدا ہو، اس کے بغیر وہ بے سود ہوتی ہیں، اسی طرح آراء وعقول وافکار جب ان میں اختلاف، تعارض وٹکراؤ ہو تو ان میں نکھار، وضوح وپختگی کا معاملہ سامنے آتا ہے، بشرطیکہ اختلاف پسندیدہ حدود میں ہو، کیونکہ ایسے اختلاف پر آراء کی تنقیح، عقل وفہم کی نشو ونما، وترقی، نیز امت کی غور وفکر، حسن نظر، عمدگی اختیار وانتخاب پر تربیت ومشق جیسے امور کا ترتب ہوتا ہے، اور یہ بڑے خیر کی چیز ہے۔

اور اگر اس کے نتائج وآثار میں صرف یہ ہوتا کہ وسعت افق نیز حدود کے اندر رہنے والے اختلافات کو قبول کرنے پر امت کی تربیت ہوتی تو یہ چیز اپنی ذات میں بڑے خیر کی تھی،

اس لئے کہ اس چیز نے ان کا یہ مزاج بنایا کہ وہ مناسب مواقع کے جائز اختلاف کو قبول کریں۔

اختلاف کے مذموم ہونے کی صورت یہ ہے کہ اختلاف ہوی وہوس پر مبنی ہو جس میں اختلاف کرنے والا اپنے اختلاف میں اللہ کی ذات ورضا کو اپنے سامنے نہیں رکھتا بلکہ محض اختلاف کی خواہش وطمع میں ایسا کرتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: مخالفت کرو تمہارا تعارف ہوگا، یا تعصب وغیرہ جیسی اغراض کی بنا پر آدمی اختلاف کرتا ہے جن کا علم اور علمی بحث وتحقیق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، یا یہ کہ اس طرح اختلاف کیا جائے کہ تفرق وگروہ بندی کی نوبت آجائے، جیسے کہ مذاہب فقہیہ سے تعلق رکھنے والے بعض لوگوں میں تعصب کی بنا پر ہوا کہ تعصب نے ان کو اس حد تک پہنچایا کہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے سے اعراض وانکار کیا جیسا کہ معروف ہے، اسی طرح باہمی ٹکراؤ، باطل جدوجہد، ایک دوسرے کے حق میں بے جا جرح وغیرہ پر آمادہ کیا، نیز سرکاری وسماجی عہدوں کے لئے ناپسندیدہ تنافس میں لگایا حتی کہ تاریخ کے بعض ادوار میں یہ بھی ہوا کہ اس کی وجہ سے مار پیٹ اور قتل وقتال کی نوبت آئی۔

حاصل یہ کہ جو اختلاف کسی شرعی نقطہ نظر پر مبنی ہو اس کا رکھنے والا معذور بلکہ مستحق اجر ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے (اختلاف کے ساتھ) اپنے اجتہاد کی بنا پر کہتا ہے، اور حق تعالی کا ارشاد ہے:

"لا يكلف الله نفساً إلا وسعها" (البقرہ:۲۸۶)۔

لیکن اگر ایک انسان کے سامنے کسی حکم پر حجت ودلیل آئے اور وہ ثابت بھی ہو اور اس کے بعد بھی وہ عناد اختیار کر کے اس سے اختلاف کرے تو اس کا یہ اختلاف مذموم ہوگا اور اسی کے لئے حق تعالی نے فرمایا ہے:

"واختلفوا من بعد ما جاءهم البينات" (آل عمران:۱۰۵) (انہوں نے ان کے پاس واضح احکام آنے کے بعد اختلاف کیا)۔

لہذا دلیل کے قائم ہونے کے بعد اور ثابت وواضح ہونے کے بعد اختلاف کرنے والا انسان مذموم ہے، کیونکہ اس کا یہ اختلاف عناد، نص سے پہلو تہی اور حق تعالی کے حکم کی مخالفت پر مبنی ہوتا ہے، اور ایسا کرنے والا بڑے خطرے سے دوچار ہوتا ہے، کیونکہ حق سبحانہ وتعالی فرماتے ہیں:

"فليحذر الذين يخالفون عن أمره أن تصيبهم فتنة أو يصيبهم عذاب أليم" (النور:٦٣) (سو جو لوگ اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو اس سے ڈرنا چاہئے کہ ان پر کوئی آفت (دنیا میں) آپڑے یا کوئی دردناک عذاب (آخرت) میں پکڑ لے)۔

فضل بن زیاد کی روایت ہے کہ امام احمدؒ نے فرمایا: میں نے قرآن مجید میں غور کیا تو تنتیس مواقع میں رسول اللہ ﷺ کی طاعت کا حکم فرمایا گیا ہے، اس کے بعد انہوں نے آیت مذکورہ بالا کو تلاوت فرمایا اور بار بار اس کی تلاوت کرتے رہے، اور فرمایا:

فتنہ (جس کا تذکرہ آیت میں ہے) کیا ہے؟ شرک، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ آدمی جب حق تعالی کی کسی بات کو رد کرے تو اس کے دل میں کسی قسم کی کجی آجائے، اور وہ بہک جائے پھر ہلاکت میں پڑ جائے، اور یہ کہہ کر اس آیت کی تلاوت فرمائی:

"فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینهم" (النساء:٦٥، ملاحظہ ہو: الابانۃ الکبری لابن بطہ العکبری ١/ ١٠٤، الصارم المسلول علی شاتم الرسول ٢/ ١١٦)۔

(قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرائیں)۔

ابو طالب مشکانی کا بیان ہے کہ امام احمدؒ سے عرض کیا گیا کہ بعض لوگ حدیث کو چھوڑ کر سفیان وغیرہ کی رائے کو اختیار کرتے اور اس پر عمل کرتے ہیں، فرمایا: مجھ کو ان لوگوں پر تعجب ہے جو حدیث کو سنیں، اس کی سند وصحت کو جانیں اور پھر اس کو چھوڑ کر سفیان وغیرہ کی رائے کو

اختیار کریں، اللہ تعالی فرماتے ہیں: "فليحذر الذين يخالفون عن أمره أن تصيبهم فتنة أو يصيبهم عذاب أليم" (النور: ۶۳)۔

اور تم جانتے ہو کہ فتنہ (مذکورہ) کیا ہے؟ کفر ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "والفتنة أكبر من القتل" (البقرہ: ۲۱۷) (فتنہ پردازی قتل سے بدرجہا بڑھ کر ہے)۔

وہ لوگ ہوا وہوس کے تحت حدیث رسول ﷺ کو چھوڑ کو رائے پر عمل کرتے ہیں

(ملاحظہ ہو: الصارم المسلول علی شاتم الرسول ۲/۱۱۶، ۱۱۷)۔

ائمہ- ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ، احمدؒ- نے حجت ودلیل کی وضاحت کی صورت میں اپنی تقلید سے منع کیا ہے (ملاحظہ ہو: مجموع الفتاوی ۲۰/۲۱۰-۲۱۲، اعلام الموقعین ۲/۲۰۰، ۲۰۱، رسالۃ القول المفید فی حکم التقلید للشوکانی ۵۴-۶۲)۔

بہر حال حق کی وضاحت نیز حجت ودلیل کی صراحت کے باوجود اللہ تعالی کے حکم کی مخالفت ایک امر مذموم ہے، اسی لئے اللہ تعالی نے اختلاف کو مقید کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"واختلفوا من بعد ما جاءهم البينات" (آل عمران: ۱۰۵) (اور ان کے پاس واضح احکام آنے کے بعد ان لوگوں نے اختلاف کیا)۔

اختلاف کو تو قید کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، جبکہ تفرق (گروہ بندی) کو مطلق منع فرمایا ہے، یہ کہہ کر:

"ولا تكونوا كالذين تفرقوا" (آل عمران: ۱۰۵) (اور ان لوگوں کی طرح مت بنو جنہوں نے باہم گروہ بندی کی)۔

اسی لئے یونس حلافی نے امام شافعیؒ کے متعلق کہا ہے کہ میں نے امام شافعیؒ سے زیادہ عقلمند نہیں دیکھا، ایک دن ایک مسئلہ میں میں نے ان سے خوب بحث کی پھر ہم لوگ ادھر ادھر ہو گئے، اس کے بعد وہ مجھ سے ملے تو میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اے ابوموسی اگر چہ ہم ایک مسئلہ میں

متفق نہ ہو سکے لیکن کیا بھائی بن کر نہیں رہ سکتے (ابن عساکر فی تاریخ دمشق: ۵۱/ ۳۰۲، ملاحظہ ہو: سیر اعلام النبلاء ۱۰/ ۱۶)۔

یہ فرما کر انہوں نے اشارہ فرمایا ہے کہ اخوت کے پہلو کی رعایت اور اختلاف میں اس کو مقدم رکھنا واجب ہے۔

شیطان کو ایسے مواقع میں دخل کا موقع ملتا ہے کہ وہ آدمی کو یہ تصور دیتا ہے کہ فلاں آدمی پر حجت قائم ہوگئی، دلیل بھی واضح ہوگئی اس کے باوجود اس نے صرف نظر واعراض کیا، ایسی صورت میں آدمی کو توقف سے کام لینا چاہیۓ، اس لئے ایک مسئلہ تمہارے نزدیک اور تمہاری رائے میں واضح ہو سکتا ہے، کیونکہ تمہارے سامنے اس کی کچھ بنیادیں ہیں، لیکن دوسرے کے نزدیک اس کا واضح ہونا ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ اس کا نقطہ نظر تم سے مختلف ہے، تم اپنی جگہ جس چیز پر مطمئن ہو اس کو اختیار کرنے میں تم پر کوئی ملامت نہیں لیکن اس کی نسبت سے تم یہ نہ سوچو کہ جس چیز کو تم نے مان لیا ہے تو اس کا بھی اس کو ماننا ضروری ہے، اس لئے کہ وہ تم سے اپنی بات منوانے میں کامیاب نہیں ہو سکا، اور تم اپنی بات اس کو سمجھانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

لہذا جب تک اس قسم کے مسائل رہیں گے جن میں اختلاف کی گنجائش ہے اور امت ان میں اختلاف کرتی رہی، اور صحابہؓ نے بھی ان میں اختلاف کیا تو ضروری ہے کہ تم اس اختلاف کرنے والے کو معذور سمجھو، جیسے کہ یہ ضروری ہے کہ وہ تم کو تمہاری رائے میں معذور جانے، اس لئے کہ بعض مرتبہ لوگ کہتے ہیں:

میں نے فلاں سے ایسا ایسا کہا لیکن وہ نہیں مانا کیا یہ قضیہ ایسا تھا کہ جس میں قطعیت تھی کہ اس میں اس کے علاوہ کی گنجائش ہی نہ تھی جس کے تم قائل ہو۔

کبھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی رائے وخیال تم پر حاوی وغالب ہو جائے، اور غور وفکر کے دوسرے راستے تم پر بند کر دے، اور پھر تم بس اپنی ہی بات کو مانو وجانو، جبکہ ہو سکتا ہے

کہ آئندہ کبھی تمہارے غور وفکر کی جہت بدل جائے اور پھر مسئلہ میں خود تمہاری رائے بھی بدل جائے جیسے کہ امام شافعیؒ واسحاق بن راہویہؒ کے درمیان باہمی گفتگو میں ہوا جو دباغت کے ذریعہ مردار کی کھال کی پاکی سے متعلق تھی، دونوں نے اس مسئلہ پر کچھ دیر بحث کی، اور اس کے بعد امام شافعیؒ نے اسحاق بن راہویہؒ کی رائے کو قبول کرلیا اور اسحاقؒ نے امام شافعیؒ کے قول کو اختیار کرلیا''

(ملاحظہ ہو: طبقات الشافعیہ الکبری ۲/۹۱-۹۲)۔

یہ واقعہ اختلاف کے افق کی وسعت کو بتاتا ہے اور للّٰہیت، اخلاص، وتقوی کے کمال کی بھی دلیل ہے، اس لئے کہ مناظرہ میں اکثر اپنی رائے کو منوانے کی بات آجاتی ہے جبکہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو اس نیت سے مناظرہ کرتے ہیں کہ ہم فریق مقابل کی بات ورائے کو قبول کرلیں گے اگر ہماری سمجھ میں اس کی صحت آگئی۔

بعض محققین کا کہنا ہے کہ مد مقابل اور اختلاف کرنے والے کے ساتھ اتفاق کا بہترین وسیلہ وذریعہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس کی جگہ رکھو اور کوشش کرو کہ اپنے آپ کو اس کے قضیہ ورائے کے حق میں دفاع کرنے والا بناؤ اور اس کی سوچ وفکر کا جوز او یہ ہے اسی سے تم سوچو۔

بعض تابعین سے منقول ہے:

''انسان کا علم جتنا بڑھتا ہے اتنا ہی دوسروں کے لئے وہ عذر رکھتا و مانتا ہے''۔ اور یہ تجربہ سے بھی ظاہر وثابت ہے، اور اس کے برعکس بھی تجربہ سے سامنے آتا ہے کہ علم وعقل کی کمی رکھنے والا، تنگ نظر، تنگ دل، جلدی پلٹ کر حملہ کرنے والا اور اتہامات والزامات کے دروازے کھولنے والا ہوتا ہے۔

امام ابو اسحاق شیرازی شافعیؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ عامی کے مقابلہ میں عالم اپنے فقہی مذہب کے لئے کم جوش رکھتا ہے، اس لئے کہ عالم اقوال وادلہ کو جتنا جانتا ہے عامی نہیں جانتا، اس لئے عالم دوسروں کے لئے عذر رکھتا و مانتا ہے، اور وہ کسی معاملہ ورائے میں ترجیح بھی ایک

مناسب حد میں رکھتا و اپنا تا ہے، اور عامی آدمی تو بس وہی جانتا و مانتا ہے جس کو وہ اپنے معتمد عالم سے سنتا ہے، اور دوسرے اقوال کو جانتا و مانتا نہیں، اس لئے کہ ان کے دلائل کو نہیں جانتا، اسی لئے وہ دوسرے اقوال کو ماننے والوں کے حق میں سخت ہوتا ہے، اور اگر اس کے علم و عقل میں وسعت آتی ہے تو اسی کے مطابق وہ دوسروں کے لئے عذر کی گنجائش رکھتا ہے۔

اس تفصیل کی بنیاد پر ہم فرق کرتے ہیں اس اختلاف میں جو کسی شرعی حجت، نظر صحیح، ہوا وہوس سے پاکی پر مبنی ہو اور آدمی اہل اجتہاد میں سے بھی ہو، اور اس اختلاف میں جس کے پیچھے کوئی شخصی غرض ہو، یا خواہش نفس، یا جذبہ شہرت، یا اس قسم کی چیز ہو کہ پہلا اختلاف تو محمود ہے اور دوسرا مذموم ہے۔

اختلاف کے مقابلہ میں تفرق - افتراق و گروہ بندی - مطلقاً مذموم ہے، اور وہ یہ کہ لوگ گروہوں، اور جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں، اور ہر گروہ و جماعت اپنی جگہ اپنی باتوں پر خوش و مطمئن ہو، ان کا معاملہ آپس میں تحالف و تعارف، تعلق و محبت کا نہ ہو، بلکہ لڑائی، اور بغض و عدوات کا ہو، یہ دین میں گروہ بندی ہے اور دین سے نسبت رکھنے والوں کی لڑائی و نزاع ہے، یہ دنیا کے لئے تفرق و گروہ بندی اور اس کے مصالح کے لئے سعی کا مسئلہ نہیں ہے۔

حالانکہ اتفاق و اتحاد تو اکثر خیر ہی ہوتا ہے اور افضل، حتی کہ دنیا کے مصالح میں بھی، جیسا کہ آج ہم ان کمپنیوں و اداروں میں دیکھ رہے ہیں جو کئی کئی براعظموں میں پھیلی ہوئی ہیں، اور بڑی بڑی حکومتوں میں اور سیاسی حلیفوں و جماعتوں و مجمعوں میں دیکھ رہے ہیں۔

اس لئے تفرق سے قرآن کریم میں مطلقاً منع کیا گیا ہے اور حق تعالی نے اس سے ڈرایا ہے اور بتایا ہے کہ بنو اسرائیل کا شر و فساد اسی راستے سے آیا، ارشاد ہے:

"واقیموا الصلاۃ ولا تکونوا من المشرکین، من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً وکل حزب بما لدیھم فرحون" (الروم: ۳۱، ۳۲) (اور نماز کی پابندی کرو اور

شرک کرنے والوں میں سے مت بنو جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرلیا، اور بہت سے گروہ ہوگئے اور ہر گروہ اپنے اس طریقہ پر نازاں ہے جو ان کے پاس ہے)۔

اور معلوم ہے کہ حق تعالی نے ہم کو کافر قوموں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، یعنی مشرکین اور یہود ونصاری، اور افسوس کی بات ہے کہ بہت سے لوگ ظاہری چیزوں میں تشبہ سے تو بچتے ہیں لیکن باطنی امور میں تشبہ سے غفلت برتتے ہیں جبکہ وہ کہیں اہم ہیں، اس لئے کہ ان کا تعلق دل سے ہے، ارشاد باری تعالی ہے:

"ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینهم و کانوا شیعاً" (الروم:۳۲) (مشرکین میں سے مت ہو کہ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرلیا اور بہت سے گروہ ہوگئے)۔

اس میں اللہ تعالی نے گروہوں اور جماعتوں کے وجود کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اور **"کل حزب بما لدیهم فرحون"** (الروم:۳۲) (ہر گروہ اپنے اس طریقہ پر نازاں ہے جو اس کے پاس ہے) میں گروہ بندی و جماعت بندی اور تحزب کا ذکر کیا ہے، کہ یہ سب مذموم ہے اس لئے کہ اس کے نتیجہ میں دین کے اندر تفرقہ آتا ہے اور اس سے مسلمانوں کی جماعت و اجتماعیت میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔

ہماری دیگر کتابیں

فقہ الاقلیات	ڈاکٹر جمال الدین عطیہ
فرد پر عبادت کے اثرات	ڈاکٹر صلاح الدین سلطان
اسلام اور تزکیہ نفس	ریاض احمد خان
فقہی مذاہب کا ارتقاء	علامہ ابوامینہ بلال فلپس

ڈسٹری بیوٹرز:

پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات

الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ پاکستان

فون: 042-37320318، فیکس: 042-37239884

kitabsaray@hotmail.com

اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔

فون: 021-32212991, 32633887